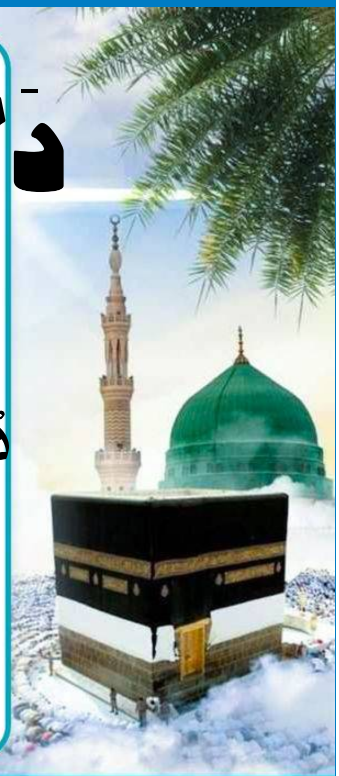
إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللهِ الْإِسْلَام

دَارُ الْاِسْلَام



نگران

ڈاکٹر خالد علوی

ایم، اے، پی، ایچ، ڈی

استاد شعبہ علوم اسلامیہ، جامعہ پنجاب لاہور

مقالہ نگار

حافظ عبد الحمید

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَام

دَارُالْاِسْلَام

نگران

ڈاکٹر خالد علوی

ایم ،اے ،پی ،ایچ ،ڈی

استاد شعبہ علوم اسلامیہ، جامعہ پنجاب لاہور

مقالہ نگار

حافظ،قاری عبد الحمید

متعلّم : ایم ،اے ،علومِ اسلامیہ (رولنمبر 1609)

ایم ،اے سیاسیات

جامعہ پنجاب لاہور 1980ء

کمپوزنگ : (مولانا) محمد موسیٰ شاکر غفراللہ لہٗ شفیلڈ یوکے



اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

فہرست

پیش لفظ

مولانا محمد موسیٰ شاکر غفر اللہ لہٗ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَحْدَهٗ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى مَنْ لَّا نَبِيَّ بَعْدَهٗ ،اَمَّا بَعْدُ:

دور نبوی علی صاحبہا الف الف تحیۃً وسلاماً جو وجہ ارض کا سب سے مسعود ترین دور اورعہد گذرا ہے، اس لیے کہ اسی دور میں خاتم الانبیاء و المرسلین سید ولد آدم محمد عربی ﷺ زمین پر موجود تھے، اُم الکتب قرآن کریم کا نزول بھی اُسی دور میں ہوا، لہٰذا اُس دور کو یہ حق بنتا ہے کہ اُسے سید الادوار، سید العہود کہا جائے، اس دور کو یہ شرف حاصل ہے کہ اسلام جیسا آسمانی مذہب اور دین اسی دور میں مکمل اور تام ہوا، اور قیامت تک پیش آنے والے تمام مسائل کے حل کے خطوط ونشانات دے کر گیا، ہم اس پر اللہ کی جتنی بھی تعریف کریں کم ہے، اللہ ہمیں اسلام کی قدردانی کی توفیق عطا فرمائے۔آمین!

جہاں دورِ حاضر میں بہت سے نئے مسائل پیش آئے اور آرہے ہیں وہیں ایک مسئلہ" دارالاسلام اور دارالکفر " کی تعیین کا بھی ہے، اس لیے کے بہت سے احکام کا تعین اس تعین پر موقوف ہے۔ کیوں کہ اب حالات عجیب طرح کے ہوگئے ہیں،حکومتیں ایک طرف " آزادی" "مساوات" "جمہوریت" کے گیت گاتے نہیں تھکتیں اور دوسری جانب ہر طرف مسلمانوں اور اسلام کے ساتھ امتیازی برتاؤ کیا جارہا ہے، اور اس باب میں غیر تو غیر، مسلمان حکمرانوں کا بھی یہی حال ہے۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان حالات میں" دارالاسلام اور دارالکفر " کا تطابق کیسے ہو؟

بہت سی تکفیری دہشت گرد تنظیموں کا نظریہ دار اسلام اور دار حرب کے تصور سمیت

متعدد تصورات سے متعلق بہت سے احکام کی گمراہ اور غلط فہم پر مبنی ہے۔اور یہ ایسے تصورات اور مسائل ہیں جو ایک دوسرے سے مربوط ہیں، لہٰذا دنیا کی دار اسلام اور دار حرب میں تقسیم ہجرت اور جہاد سے متعلق احکام پر مشتمل ہے۔ دنیا کے ممالک کو اسلامی اور غیر اسلامی ریاستوں میں تقسیم کرنے کا مسئلہ فقہ میں سیاسی نوعیت کے اہم ترین موضوعات میں سے ایک ہے، کیونکہ یہ دنیا کے متعلق اسلامی تصور اور جہاد کے مسائل سے ربط رکھتا ہے اور مذہبی اقلیتوں کے احکام بھی اس سے جڑے ہوئے ہیں اس لئے کہ یہی بین الاقوامی تعلقات کے متعلق فقہی تصور کی بنیاد ہے۔

قرآن کریم یا سنتِ مطہرہ میں ایسی کوئی دلیل نہیں ہے جو ایمان اور کفر پر یا امن اور جنگ کے مطابق دنیا کے ممالک کی تقسیم کو بیان کرتی ہو یا اس کی طرف اشارہ کرتی ہو۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ یہ تقسیم اس وقت کے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان باہمی تعلقات کا ایک فقہی نقطۂ نظر ہے، جن میں اگر معاہدہ موجود نہیں ہوتا تو اکثر اوقات ان معاملات میں جنگ ہی واحد حکم ہوتی تھی۔

لہٰذا یہ تقسیم شریعت کی اساس پر نہیں بلکہ حالِ واقع کی بنیاد پر ہے،جس کا مقصد دنیا کو ایسی دو ریاستوں، یا دو سیاسی بلاکس کے تحت کرنا نہیں تھا جن میں سے ایک میں سارے اسلامی ممالک شامل ہوں اور ایک ہی ریاست ان پر حکومت کرے، اور دوسرے بلاک میں باقی ممالک شامل ہوں اور ایک ہی ریاست ان پر حکومت کرے، بلکہ یہ تقسیم اسے لئے تھی کہ مسلمان اپنے ملک میں امن وسلامتی سے رہتے تھے، اور اپنے ملک سے باہر خوف اور عداوت پائی جاتی تھی۔

قاری عبدالحمید صاحب نے اپنے ایم اے کے اس مقالے کے اندر اسی سے متعلق فقہاء کرام اور علمائے ربّانی کی تحقیقات، احکام اور قوانین کو یکجا جمع کیا ہے۔

تو آیئے! ہم اس مقالے کا خلاصہ اس مضمون میں جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔

دار کی تعریف:

دار اس ملک کو کہتے ہیں، جو تین چیزوں کو شامل ہو:

(۱) اِقلیم (Country): یعنی محدود جغرافیائی مقام۔

(۲) سکان (Population): یعنی اس علاقہ کے آباد لوگ۔

(۳) سلطنت (Kingdom): وہ قیادت جو اس منطقہ میں قائم ہو۔

امام ابن العابدین تحریر فرماتے ہیں:

المراد بالدار الاقلیم المختص بقهر ملک اسلام وکفر۔

عمار بن عامر، اس کی شرح میں تحریر فرماتے ہیں:

یظهر من التعریف انه شرط فی الدار. الاقلیم والسکان و السلطنة.

(الهجر ألی بلاد غیر المسلمین. ص ۹)

دار کی تقسیم:

نفاذ قوانین کے اعتبار سے حکومت کی دو قسمیں ہیں: (۱) دار الاسلام (۲) دار الکفر۔ پھر دارالاسلام کی بھی دو قسمیں ہیں: (۱) دار الاسلام حقیقی (۲) دارالاسلام حکمی

دارالاسلام حقیقی کی تعریف:

اس ملک کو کہتے ہیں جہاں دستوری طور پر اسلامی قوانین اور اسلامی احکام نافذ ہوں، اور اس ملک کے قائدین وحکام مسلمان ہوں۔ امام ابن القیم الجوزی رحمۃاللہعلیہ فرماتے ہیں:

دارالاسلام هی التی نزلها المسلمون وجرت علیها احکام الاسلام.

(احکام اہل الذمہ:ج۲،ص ۲۸)

اورامام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

تعبر الدار دارالاسلام بظهور احكام الاسلام فيها وان كان جل اهلها من الكفار. (المبسوط:ج۱۰، ص ۱۴۴)

دارالاسلام حکمی:

اس ملک کو کہتے ہیں جہاں مسلمانوں کو اپنے بعض شعائر پر عمل کی اجازت ہو، مثلاً: نماز، اذان، جمعہ وغیرہ، اگر چہ وہاں عالمی وضعی (خودساختہ یعنی انسان کے بنائے ہوئے نہ کہ اللہ کے نازل کردہ) قانون نافذ ہو، البتہ وہاں کے قائدین اور حکومتی کارندے مسلمان ہوں۔ اس وقت تمام اسلامی ممالک اسی حکم میں ہیں، کوئی ملک حقیقی دارالاسلام کا مصداق ومجاز نہیں ہے۔ ابن العابدین تحریر فرماتے ہیں:

لو اجريت احكام المسلمين فى بلد واحكام اهل الشرك فلاتكون دار حرب ما دامت تحت سلطة ولاتنا. (شامی:ج۴،ص۱۷۵)

ان دارالفسق هی دار الاسلام. (نیل الاوطار:ج۸، ص ۲۷)

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے، کہ جب اسلامی قوانین کا نفاذ، ان ممالک میں نہیں ہے، تو پھر ان ممالک کو دارالاسلام کیوں کہا جاتا ہے؟ تو اس کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ اس میں حرج لازم آتا ہے، کیوں کہ اگر باوجود کثرت و اغلبیت مسلمین کے، اس کو"دارالکفر" کہا جائے، تو یہ خرابی لازم آئے گی، کہ دشمن آسانی سے اسلامی ممالک پر قابض ہوجائے گا، کیوں کہ"دارالکفر" ہونے کی وجہ سے، مسلمانوں کے لیے اگر کوئی باطل طاقت حملہ آور ہو، تو دفاع

لازم نہ ہوگا، اور یوں ایک ایک کرکے، تمام اسلامی ریاستیں دشمنوں کے ہاتھ چلی جائیں گی۔ ہاں البتہ اس کو "دارالاسلام الفاسقۃ" کہا جائے، تو کوئی حرج نہیں، یا صرف "دارالفسق" کہا جائے،

لواعتبرنا هذه الديار من دارالكفر او الحرب فهذا يعنى ان المسلمين على كثرتهم سيغدون من غير اوطان ولا ديار وفى هذا تمكين لاعداء الله منا اضافة الى ا نه لايجب على المسلمين الدفاع عنها فى حال الاعتداء عليها من الكفار. (فقه الاقليات:ص٩٧)

دارالکفر کی بھی دو قسمیں ہیں:

(۱) دارالکفر حقیقی۔(۲) دارالکفر حکمی۔

داراالکفر حقیقی:

اس ملک کو کہا جاتا ہے، جہاں پر زمام حکومت غیرمسلموں کے ہاتھ میں ہو، اور وہاں کا دستورِاساسی بھی انہیں کا ہو، اور مسلمانوں کو شعائر اسلام بجالانے کا قطعاً حق نہ ہو، بلکہ حکومت مسلمانوں کو ہلاک کرنے اورنقصان پہنچانے کے درپے ہو، مثلاً: رشیا جو ۱۹۹۲ء سے پہلے اسلام اور مسلمانوں کا کٹر دشمن رہا، اوراس وقت اسرائیل ہے۔

دارالكفر حقيقةً: وهى التى قصدها الفقهاء فى تعريفهم لدار الكفر وهى التى تظهر فيها احكام الكفر و يحكمها الكفار و انعدمت فيها مظاهر الدين تمامًا بحيث لم يعد لها وجود متميز و لا يوجد فيها مسلمون يوٴدون واجبا تهم الدينية.

(تقسیم العالم:ص۲۵)

دارالکفر حکمی: اس مملکت کو کہا جاتا ہے، جہاں حکومت تو غیر مسلموں کی ہو، دستور بھی ان کا ہو، مگر مسلمانوں کو اپنے شعائر کے بجا لانے کی اجازت ہو، مثلاً :بعض یوروپی ممالک، بعض ایشیائی ممالک ، بعض افریقی ممالک ، جہاں مذکورہ صورت حال ہو، اس کو دارالاسلام اور دارالعہد بھی کہا جاتا ہے۔

والعلة فی الذهاب الی الحبشة ان هناک ملکا لا یظلم عنده احد و کان العدل فی ذاته وسامًا لذالک الملک و سماها المسلمون دار امن و ان لم تکن دار ایمان. (تفسیر الشعراوی: ۴/۲۵۸)

دار کی ایک تقسیم وجود امن اور عدم امن کے اعتبار سے بھی ہے، جس کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں، حالت جنگ اور حالت امن کے اعتبار سے بھی دو قسمیں ہیں:

(۱) دارالحرب:

جہاں حکومت مسلمانوں کے ساتھ برسرِ پیکار ہو، ان کے مال ان کے املاک ، اور ان کی جان کو ختم کرنے یا نقصان پہنچانے کے درپے ہو، اور وہاں اسلامی دعوت کو ممنوع قرار دیا گیا ہو، اس کو ملک کو "دارالحرب" کہا جائے گا، اور اس کو "دارالکفر ، دارالشرک، دارالمخالفین" بھی کہا جاسکتا ہے۔

(۲) دارالامن والعہد:

جہاں حکومت تو اسلام اور مسلمانوں کی دشمن ہو، مگر وہ مسلمانوں کے ساتھ امن کا معاہدہ کر چکی ہو، تو پھر اسے "دارالامن یا دارالکفر الآمنه یا دارالعهد یا دار الکفر المعهودة" کہا جائیگا۔

بعض حضرات "دار حیاد" بھی ایک قسم قرار دیتے ہیں، "دار حیاد" اس ملک کو کہتے

ہیں، جو مسلمانوں کے ساتھ مصالحت کرے، کہ نہ وہ ان سے قتال کریں گے ۔ نہ مسلمانوں کے خلاف کسی کا تعاون کریں گے۔ ابوزہرہ رضی اللہ عنہ اور وہبہ زحیلی نے یہ قسم الگ شمار کی ہے۔

(العلاقات الدولیہ فی الاسلام: ص۸۴، آثار الحرب: ص۱۹۷)

یہ تھا مختصراً دار کا بیان، اخیر میں ہم اللہ سے دست بدعا ہیں کہ ہم مسلمانوں کو کوئی دارالاسلام عطا فرمائے، یا قیام خلافت کی کوئی سبیل اللہ رب العزت ہمارے نکالے۔ آمین یارب العالمین!

یہاں ایک وضاحت کردینا مناسب ہوگا کہ دارالاسلام اور دارالکفر قرآن و حدیث میں صراحتاً مذکور نہیں، لہٰذا "دار" کی یہ تقسیم توقیفی نہیں، یعنی منصوص نہیں ہے، بل کہ مجتہد فیہ، لہٰذا اس میں اختلاف کی گنجائش ہے، جیسے فقہاء متقدمین تقسیم ثنائی کے قائل تھے، اور ان میں بھی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ثلاثی کے قائل تھے، یعنی ان کے یہاں دار کی تین قسمیں ہیں: (۱) دارالاسلام (۲) دارالکفر ، اور (۳)العہد یا دارالہدنۃ یا دارالصلح، جیسا کہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے روضۃ الطالبین ج:۵، ص۴۳۲۔ پر ذکر کیا ہے، جیسے جیسے زمانہ کے احوال بدلتے گئے، اس کی تقسیم میں بھی اضافہ یا ردّ وبدل ہوتا گیا، مثلاً: امام ابن تیمیہ نے ایک اور قسم "دارالفسق" کو ذکر کیا ہے، جیسا کہ ان کی کتاب مجموع الفتاوی ج: ۱۸ ص: ۲۸۲۔ پر اس کا ذکر ملتا ہے، دورِ حاضر میں حالات کے بدلنے سے فقہاء نے "دارحیاد" کی اصطلاح وضع کی، جیسا کہ ابوزہرہؒ اور علامہ وہبہ زحیلی کے حوالے سے اوپر ذکر کیا گیا۔ غرضیکہ "دار" کے منصوص نہ ہونے کی وجہ سے ابھی اس میں اجتہاد و مزید تقسیم کی گنجائش ہے، مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں، کہ ہر کوئی تقسیم کے لیے قلم توڑنا شروع کردے، جو لوگ علومِ شرعیہ، قرآن،

حدیث، فقہ، اصول فقہ اور قواعد فقہ وغیرہ پر کڑی اور گہری نظر رکھتے ہوں، وہی یہ فریضہ انجام دے سکتے ہیں۔

اللہ ہمارے ان تمام فقہاء کی قبروں کو نور سے بھر دے، اور ہمیں ان کے خون پسینے سے تیار کردہ، فقہ کی قدردانی کی توفیق عطا فرمادے۔

جب میں نے حاجی محبت علی صاحب کے لئے کتاب (آپ بیتی) لکھی تو اس کے کافی عرصہ بعد قاری عبدالحمید صاحب نے ذکر کیا کہ میں نے بھی دارالاسلام کے موضوع پر لکھا ہے آپ کو دیکھاؤں گا، میں سمجھا کہ شائد کوئی تیار کتاب ہو گی، اس کو دکھانا چاہ رہے ہوں گے، لیکن جب آپ نے مجھے وہ حوالہ کی تو میں نے دیکھا کہ وہ قلمی نسخہ ہے، جو آپ نے جامعہ پنجاب سے 1980ء میں پی، ایچ، ڈی کرتے ہوئے لکھا تھا، جس سے معلوم ہوا کہ آپ چھپے رستم ہیں، اور پی، ایچ، ڈی کئے ہوئے ہیں، اور پھر آپ نے مجھے اسے کمپوزنگ کرنے کو کہا۔

مجھے اگر چہ فرصت نہیں تھی میں اپنی دیگر کتب پر کام کر رہا تھا، اور ساتھ ہی ساتھ مجھے ایک سال سے بازوؤں پر بھی تکلیف ہے، جس کی وجہ سے لکھنا مشکل ہو گیا ہے، لیکن میں نے قاری صاحب سے لکھنے کی حامی بھر لی، اور اللہ کی مدد سے اسے کمپیوٹرائز کر کے آپ کی خدمت میں پیش کرنے جارہا ہوں۔

رب العالمین سے دعاء گو ہوں کہ وہ قاری عبدالحمید صاحب کی اس کاوش کو قبول فرمائے۔ اور اسے مقبولیت عامہ عطا فرمائے، آمین یارب العالمین!

محتاجِ دعاء:

(مولانا) محمد موسیٰ شاکر غفر اللہ لہٗ: (49 گلن روڈ شفیلڈ یو کے)

ابتدائیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہمارے دینی لٹریچر میں دار الاسلام اور دار الحرب کے الفاظ اکثر جگہ استعمال ہوئے ہیں اور بہت سے احکام اورقوانین کو دار الاسلام یا دار الحرب کی شرط کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے ۔اس موضوع پر کتابوں میں متفرق طور پرتحریری مواد بہت ملتا ہے،لیکن یکجا طور پر کسی ایک کتاب میں یہ تمام مسائل اکھٹے نہیں کئے گئے ۔

میں نے ایم ، اے ، کے مقالے کے لئے اس موضوع کو منتخب کیا ،اور اس سے متعلق احکام وقوانین کوایک خاص ترتیب سے جمع کرنے کی کوشش کی ۔

میں صدر شعبہ علوم اسلامیہ جامعہ پنجاب کا ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے اس موضوع پر مقالہ تحریر کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی ۔

میں جناب ڈاکٹر خالد علوی صاحب کا بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے اس سلسلہ میں اپنے گراں قدر مشوروں سے نوازا ۔ اللہ تعالیٰ سے دعاء ہے کہ وہ اس حقیر سعی کو قبول فرمائے ۔

حافظ عبد الحمید

دار الاسلام

اور

دار الحرب

دارالاسلام کی تعریف

اسلامی قانون کے مطابق تمام دنیا دوحصوں میں منقسم ہے، ایک حصّے کو دار الاسلام کہتے ہیں، اور دوسرے حصّے کا نام دار الحرب ہے۔ اب سب سے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ دارالاسلام کسے کہتے ہیں؟ چنانچہ اس سلسلے میں فقہا کی تصریحات حسب ذیل ہیں:

١) دار الالسلام اسم للموضع الذی یکون تحت المسلمین ۔

(الفرد والدولة فی شریعة الاسلامیة :ص:١٨)

دارالاسلام اس مقام کا نام ہے جہاں مسلمانوں کوغلبہ حاصل ہو۔

٢) دارالاسلام ھی التی تظھر فیھا شعائر الاسلام بقوة المسلمین و منعتھم ۔

(الفرد والدولة فی شریعة الاسلامیة :ص:١٨)

دارالاسلام سے وہ علاقہ مراد ہے جہاں مسلمانوں کی قوت اور اقتدار کے نتیجے میں اسلامی شعارنمایاں ہوں۔

٣) ان المراد بدار الاسلام بلاد یجری فیھا حکم امام المسلمین ویکون تحت قھرہٖ۔

دار السلام سے مراد وہ شہر ہیں جن میں مسلمانوں کے امام کا حکم جاری ہو اور وہ شہر اس کے زیر حکومت ہوں۔

(فتاوی عزیزی:ص٤٢١)

٤) تشمل دار الاسلام البلاد التی تظھر فیھا احکام الاسلام ، او

يستطيع سكانها المسلمون ان يظهروا فيها احكام الاسلام

دارالاسلام میں ہر وہ ملک شامل ہے جس میں کھلم کھلا احکام اسلام پر عمل کیا جاتا ہو، یا اُس کی مسلمان آبادی علی الاعلان احکام اسلامی پر عمل کرنے کی قدرت رکھتی ہو۔

(التشریع الجنائی الاسلامی ج۱ ص۲۷۵)

۵) كل ارض تقوم فيها عقيدته ، وتعمل فيها شريعته فهى دار الاسلام ۔

ہر وہ خطۂ ارض جس میں مسلمانوں کے عقیدہ کو فروغ و غلبہ حاصل ہو، اللہ کی شریعت کی عمل داری ہو وہ دارالاسلام کہلائے گا۔

(معالم فی الطریق ص۱۴۵)

۶) وقد سمى الفقهاء المسلمون الدولة الاسلامية باسم دار الاسلام وهى تحمل ذات المعنىٰ الذى تحمله كلمة "الدولة" فى اصطلاح القانونى الحديث۔

فقہائے اسلام اسلامی ریاست کو دار الاسلام کے نام سے موسوم کرتے ہیں جس میں جدید قانون کے مطابق ریاست کی تمام خصوصیات موجود ہوں ۔

(الفرد والدولة فی شریعة الاسلامیة ص۱۷)

۷) وان هناک دار ا واحدة هى دار الاسلام ،تلک التى تقوم فيها الدولة المسلمة ، فتهيمن عليها شريعة الله ، وتقام فيها حدودهٗ ، ويتولى المسلمون فيها بعضهم بعضا۔

دنیا میں صرف ایک ہی ایسی سرزمین ہے جسے دارالاسلام کہا جا سکتا ہے، اور وہ وہ ملک

ہے جہاں اسلامی ریاست قائم ہو، شریعت الٰہی کی فرمانروائی ہو، حدود اللہ کی پاسداری ہو، اور جہاں مسلمان مل کر امور مملکت سرانجام دیتے ہوں ۔

(معالم فی الطریق ۔ص ۱۳۷)

8) فقہائے اسلام کی اصطلاح میں دار الاسلام سے مراد ایک ایسی باقاعدہ منظم ریاست یا ملک ہے جس کا سربراہ مسلمان ہو، جہاں اسلامی شریعت کے احکام عملی طور پر نافذ ہوں ۔

(اردو دائرہ معارف اسلامیہ ۔ج۹ ص ۱۰۲)

9) تمام فقہائے امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ دارالاسلام وہی ہوگا جس کا قانون اور محاکم شریعہ کا نظام وفصل خصومات (یعنی قانونی فیصلے) اسلامی قانون سے ہوں ۔

(مجموعہ قوانین اسلام ج ۴ تقریظ)

10) دارالاسلام وہ علاقہ ہے جہاں مسلمانوں کی حکومت ہو، اور اس حکومت میں اسلامی قانون بالفعل نافذ ہو، یا حکمرانوں میں اتنی قوت ہو کہ اس قانون کو نافذ کر سکیں ۔

(سود ص ۴۰۵)

فقہائے اسلام نے دارالاسلام کی جو مختلف تعریفیں بیان کی ہیں ان میں سے بعض میں دارالاسلام کے بعض پہلوؤں پر زور ہے، اور بعض میں کچھ اور پہلو نمایاں ہیں ۔ کسی تعریف میں اقتدار اور رقبہ کے اجزاء نمایاں ہیں، اور کسی میں نظام حکومت اور آبادی پر زور ہے ۔ تاہم جمہور فقہاء نے دارالاسلام کا مدار اقتدار و اختیار قرار دیا ہے ۔ جس ملک کا اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو اور انہیں یہ اختیار حاصل ہو کہ وہ اسلام کا قانون رائج کرنا چاہیں تو کوئی طاقت ان کی راہ میں حائل نہ ہو وہ دارالاسلام ہے۔

مولانا مودودیؒ دارالاسلام کی تعریف کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

درحقیقت صحیح معنوں میں تو دارالاسلام صرف وہ علاقہ ہے جہاں اسلام بحیثیت

ایک نظام زندگی کے حکمران ہو ،اور جہاں اسلامی قانون ملکی قانون کی حیثیت سے نافذ ہو۔لیکن اگر کبھی ایسی حالت پیدا ہو جائے کہ کسی ملک میں اقتدارحکومت ہوتومسلمانوں ہی کے ہاتھ میں ،مگر وہ اسلام کے بجائے کوئی اور نظامِ زندگی قائم کر دیں ، اوراسلامی قانون کے بجائے کوئی اور قانون نافذ کرنے لگیں تو فقہائے اسلام اُن سے مایوس ہو کر دفعتہً اس ملک کے دار الکفر ہونے کا اعلان کر دینا مناسب نہیں سمجھتے ، بلکہ وہ اسے بالقوۃ دارالاسلام ہی قرار دیئے چلے جاتے ہیں جب تک کہ وہ مسلمان خود اسلام سے اپنا برائے نام تعلق بھی منقطع نہ کرلیں۔فقہاء کا یہ محتاط طرزِعمل اس وجہ سے ہے کہ مسلمانوں کی کسی بااختیار حکومت کا اپنے اصول اورقوانین میں نا مسلمان ہونا لامحالہ دو ہی وجوہ میں سے کسی ایک وجہ پر مبنی ہوسکتا ہے۔ ایک یہ کہ ملک کے مسلمان باشندے تو بدستور اسلام ہی کے معتقد ہوں اور اسی کی پیروی میں زندگی بسر کرنا چاہتے ہوں ،مگرکسی نہ کسی سبب سے ایک گمراہ طبقہ زمام کار پر قابض ہو گیا ہو۔

دوسرے یہ کہ ملک کے باشندوں میں عام طور پر جہالت اور گمراہی پھیل گئی ہواور اُن کی اپنی پسند سے وہ ضال اور مضل طبقہ برسرِ اقتدار آیا ہو جو غیر اسلامی طریقوں پر قومی معاملات چلا رہا ہو۔پہلی صورت میں تو یہ عین متوقع ہے کہ عامۂ مسلمین کا اسلامی شعور آخر کار بیدار ہوگا، اور وہ اس گروہ کے اقتدار کو الٹ پھینکیں گے جو اسلام کے گھر میں کفر کا کاروبار چلا رہا ہے۔اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس عارضی غلبۂ کفر کو دیکھ کر مایوس ہو جائیں ، اور جلد بازی سے کام لے کراس گھر کوخود ہی کفر کا گھر قرار دے بیٹھیں۔

رہی دوسری صورت تو وہ بلا شبہ مایوسی کا مقام ہے۔لیکن جس قوم نے جہالت اور گمراہی کے باوجود ابھی تک اسلام سے اپنا تعلق نہیں توڑا ہے اور جو اس قدر بگڑ جانے پر بھی اپنا مذہب ابھی تک اسلام ہی بتائے جا رہی ہے اس کی طرف سے ہم بھی اتنے مایوس نہیں ہو

سکتے کہ اصلی اور حقیقی اسلام کی طرف اس کی واپسی کی ساری امیدیں منقطع کر لیں ۔لہٰذا ہم اس کے گھر کو بھی دار الکفر نہیں کہیں گے بلکہ دار الاسلام ہی کہتے رہیں گے،لیکن یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ عملاً اسلامی قانون کا تعلق صرف اس دار الاسلام سے ہے جو بالفعل دار الاسلام ہو

(سود،ص۴۰۷-۴۰۶)

دارالاسلام درحقیقت مسلمانوں کے لئے امن وسلامتی کا گھر ہے اور دارالاسلام کا قیام مسلمانوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔

مولانا مودودیؒ تفہیم القرآن میں لکھتے ہیں: کفر وفسق کا غلبہ جو بندگئ رب کی راہ میں مانع اور اعلائے کلمۃ اللہ کی سعی میں مزاحم ہو اہل ایمان کے لئے سب سے بڑی مصیبت ہے جسے قرآن "فتنہ" قرار دیتا ہے۔اس فتنے سے خلاصی پا کر جب ان کو ایک ایسا دارالاسلام میسّر آجائے جس میں اللہ کا پورا دین بے کم وکاست نافذ ہو اور اس کے ساتھ ان کو ایسے ذرائع ووسائل بھی بہم پہنچ جائیں جن سے وہ خدا کی زمین پر کفر وفسق کی جگہ ایمان وتقویٰ کا سکّہ رواں کرسکیں تو یہ ان پر اللہ کی نعمت کا اتمام ہے۔

(تفہیم القرآن،ج۵ص۴۴)

دارالحرب کی تعریف

فقہائے کرام نے دارالاسلام کے مقابل بالعموم دارالحرب کی اصطلاح استعمال کی ہے۔چنانچہ مختلف فقہاء نے دارالحرب کی جو تعریف بیان کی ہے ان کو درج کیا جاتا ہے۔

1) عبدالقادر عودہ شہید اپنی کتاب التشریع الجنائی الاسلامی میں لکھتے ہیں:

تشمل دار الحرب كل البلاد غير الاسلامية التى لا تدخل تحت سلطان المسلمين ، اولا تظهر فيها احكام الا سلام ، سواء كانت

هذا البلاد تحكمها دولة واحدة ، او تحكمها دول متعدده ، ويستوى ان يكون بين سكانها المقيمين بها اقامة دائمة مسلمين او لا يكون ، مادام المسلمون عاجزين عن اظهار احكام الاسلام ۔

دارالحرب ان تمام غیر اسلامی ممالک پر مشتمل ہے جو مسلمانوں کے زیرِ اقتدار نہ ہوں، یا جن میں احکام اسلام پر علی الاعلان عمل نہ کیا جاتا ہو، خواہ ان ممالک پر ایک ریاست حکمران ہو یا متعدد ریاستیں ہوں ،اور خواہ ان ممالک کے مستقل باشندے مسلمان ہوں یا غیر مسلم ہوں اور مسلمان ہوں تو وہ علی الاعلان اسلامی احکام پر عمل نہ کر سکتے ہوں ۔

(التشریع الجنائی الاسلامی ،ص۷۷ج1)

2) سیّد قطب شہید اپنی کتاب معالم فی الطریق میں لکھتے ہیں۔

الارض التی لا یهیمن فیها الاسلام، ولا تحکم فیها شریعة هی دار الحرب بالقیاس الی المسلم والی الذمی المعاهد کذالک ۔

وہ سرزمین جس پر اسلام کی حکمرانی کا پھریرا نہ لہراتا ہو، اور شریعت الٰہی کو نافذ نہ کیا جاتا ہو وہ مسلمانوں کے لئے بھی اور دارالاسلام کے ذمی معاہد کے لئے بھی دارالحرب ہے۔

(معالم فی الطریق،ص۱۴۳)

3) سید قطب شہید آگے چل کر پھر لکھتے ہیں ۔

کل ارض تحارب المسلم فی عقیدته و تصده عن دینه وتعطل عمل شریعته فهی دار الحرب ۔

جو ملک مسلمان کے عقیدہ و ایمان سے برسر پیکار ہو، دینی امور کے سرانجام دینے میں

اُسے مانع ہو، اور اتباع شریعت کو معطل کر رکھا ہو وہ دار الحرب شمار ہو گا۔

(معالم فی الطریق ۱۴۵)

4) اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں دارالحرب کی درج ذیل تعریف بیان کی گئی ہے۔

دار الحرب سے مراد دشمنان اسلام کا وہ علاقہ یا ملک ہے جس کے باشندے دعوت اسلام کو مسترد کر کے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سرکشی اور عداوت کا اظہار کریں، اور جہاں اہل اسلام اور اہل ذمہ کی عبادت گاہیں محفوظ نہ ہوں۔

(اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۹ ص ۱۱۰)

مندرجہ بالا تعریفات کی روشنی میں دار الاسلام اور دار الحرب کے مابین نقطۂ امتیاز یہ قرار دیا جا سکتا ہے کہ جس مملکت میں اسلامی قوانین کو بالفعل یا بالقوۃ نافذ کیا جا سکے، اور غیر مسلم رعایا اپنے مذہبی امور پر عمل کرنے میں اس کی اجازت ومنظوری کی محتاج ہو وہ ملک دار الاسلام کہلائے گا۔ لیکن جس مملکت پر غیر مسلموں کا اس طرح تسلط ہو ہو کہ وہ مملکت اپنی مسلم رعایا پر ان کے اسلامی احکام وقوانین نافذ کرنے پر بالفعل یا بالقوۃ قاصر ہو، اور مسلمان قوم کے افراد اپنے مذہبی احکام پر عمل کرنے میں اس کی اجازت کے محتاج ہوں تو وہ مملکت دار الحرب کہلائے گی۔

دار الحرب مسلمانوں کے لئے دشمنی اور خوف کا مرکز ہوتا ہے اور بعض اوقات وہاں ایمان اور اسلام کے بالکل ابتدائی تقاضوں کا پورا کرنا بھی ممکن نہیں ہوتا اور مجرد اسلام کے ساتھ نسبت ہی جان و مال اور عزت وآبرو کے لئے خطرہ بن جاتی ہے۔ ایسی صورت میں جس گوشۂ زمین کے متعلق بھی اس کا گمان ہو کہ وہاں مسلمانوں کے لئے جان و ایمان کی معمولی امان حاصل ہو سکے گی انہیں وہاں منتقل ہو جانا چاہئے۔ اور اگر اپنے ہی ملک کے جنگل اور پہاڑ انہیں پناہ دے سکیں تو اپنے ایمان کو لے کر ان کے اندر جا چھپنا چاہئے۔ اس

جدوجہد میں کامیابی ہو یا نہ ہولیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ اپنی محنت، کوشش اور اخلاص کا اجر ضرور پائیں گے۔

دارالحرب کب دارالاسلام بنتا ہے؟

دار الاسلام اور دار الحرب کے سلسلے میں یہ بحث بھی بڑی اہم ہے کہ دار الحرب کب دارالاسلام بن جاتا ہے، اور دارالاسلام کیسے دارالحرب قرار پاتا ہے۔ چنانچہ اس مسئلہ کے متعلق کہ دارالحرب کب دارالاسلام بن جاتا ہے فقہاء کی تصریحات حسب ذیل ہیں۔

1) فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے:

دار الحرب تصير دار الاسلام بشرط واحد ، وهو اظهار حكم الاسلام فيها ۔

دارالحرب صرف ایک شرط پائے جانے سے دارالاسلام ہو جاتا ہے اور وہ شرط یہ ہے کہ اس دارالحرب میں اسلام کا حکم ظاہر کر دیا جائے۔

(فتاوى عالمگیریہ. ج۲. ص۲۳۲)

2) درّمختار میں ہے:

دار الحرب تصير دار الاسلام باجراء احكام اهل الاسلام فيها ۔

دار الحرب اسی حالت میں دار الاسلام ہو جاتا ہے کہ اہل اسلام کے احکام اس میں جاری ہو جائیں۔

(رد المحتار. ج۴. ص۱۷۵)

گویا دار الحرب کا کوئی علاقہ جب مسلمانوں کے زیر اقتدار آجائے اور وہاں اسلامی احکام باضابطہ طور پر نافذ کر دیئے جائیں تو وہ علاقہ دار الاسلام بن جاتا ہے اور اس

وقت سے اس کے احکام دار الاسلام کے ہوں گے ۔فقہائے اسلام نے صرف اتنا فرق کیا ہے کہ دوران جنگ میں جو علاقہ اسلامی فوجوں کے قبضہ میں آ جائے اور ابھی یہ امر مشتبہ ہو کہ یہ قبضہ عارضی ہے یا مستقل ہے، اس کے احکام دار الحرب کے سے ہوں گے ۔ اور جب قبضہ مستحکم ہو جائے تو اسلامی حکومت اس کے دار الاسلام ہونے کا اعلان کر دے گی اور اس وقت سے اس کے احکام اسلامی مقبوضات کے سے ہوں گے۔

(الجہاد فی الاسلام.ص۵۷٦)

دستوری قانون کے نقطۂ نظر سے دار الاسلام کا مقابل دار الکفر بمعنیٰ علاقہ غیر ہی ہوسکتا ہے ۔حرب اور غیر حرب کا اس میں کوئی دخل نہیں ۔ جو ممالک اسلامی سلطنت سے صلح رکھتے ہیں وہ بھی دار الکفر ہیں ۔لیکن چونکہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں جتنے دار الکفر اسلامی سلطنت سے متصل تھے وہ عموماً دار الحرب ہی رہتے تھے اس لئے بعد کے فقہا نے دار الکفر کو بالکل دار الحرب کا ہم معنیٰ سمجھ لیا۔ مولانا مودودی کے نزدیک ہر دار الکفر دار الحرب نہیں ہے بلکہ صرف وہ علاقہ دار الحرب ہے جس سے بالفعل دار الاسلام کی جنگ ہو۔

(سود.ص۳۴۷)

دار الاسلام کب دار الحرب بنتا ہے؟

اگر کوئی ملک دار الاسلام ہو تو وہ کب اور کن حالات میں دار الحرب میں تبدیل ہو جائے گا اس میں فقہاء کے درمیان اختلافِ رائے پایا جاتا ہے ۔ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک صرف ایک شرط کے پائے جانے سے دار الاسلام دار الحرب ہو جائے گا ۔لیکن امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک دار الاسلام کا دار الحرب بن جانا تین شرائط پر موقوف ہے۔

1) فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے:

انما تصیر دار الاسلام دار الحرب عند ابی حنیفة رحمه الله

تعالیٰ بشروط ثلاثة ، احدھا اجراء احکام الکفار علی سبیل الاشتھار وان لا یحکم فیھا بحکم الاسلام ۔ والثانی ان تکون متصلة بدار الحرب لا یتخلل بینھما بلد من بلاد الاسلام ، والثالث ان لا یبقی فیھا مؤمن ولا ذمّی آمناً بامانه الاوّل الذی کان ثابتا قبل استیلاء الکفار للمسلم باسلامه وللذمی بعقد الذمّة۔۔۔۔۔۔۔۔۔

وقال ابو یوسف و محمد رحمھما اللّٰه تعالیٰ بشرط واحد لا غیر ، وھو اظھار احکام الکفر وھو القیاس۔

(فتاویٰ عالمگیریہ.ج۲.ص۲۳۲)

دارالاسلام امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اُس وقت دارالحرب ہو جاتا ہے جب اس میں یہ تین شرطیں پائی جائیں:

پہلی شرط یہ ہے کہ اس دارالاسلام میں کفار کے احکام جاری و شائع ہو جائیں اور وہاں اسلام کا حکم باقی نہ رہے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ دارالحرب کے ساتھ وہ دارالاسلام متصل ہو جائے ،اور ان دونوں مقامات کے درمیان میں اسلام کا کوئی شہر نہ ہو۔

تیسری شرط یہ ہے کہ اس دارالاسلام میں کوئی مسلمان امن کے ساتھ باقی نہ رہے اُس امن کے ذریعہ سے جو سابق میں اس کو اسلام کے سبب سے حاصل تھا۔

اور نہ وہاں کوئی کافر ذمّی امن کے ساتھ باقی رہ جائے اس امن کے ذریعہ سے جو سابق میں اس کو حاصل تھا۔۔۔۔

اور امام ابو یوسف اور امام محمدؒ کا قول یہ ہے کہ جب کسی مقام میں کفر کے احکام

شائع ہو جائیں تو وہ مقام صرف اسی ایک شرط کے پائے جانے سے دارالحرب ہو جائے گا، دوسری شرط کی ضرورت نہیں اور یہی حکم قیاس کے موافق ہے۔

(فتاویٰ عزیزی،ص۵۵۵)

امام ابوحنیفہؒ اور صاحبین کے درمیان اس مسئلہ میں جو اختلاف پایا جاتا ہے اس کا ذکر مبسوط، بدائع الصنائع، درّ مختار اور دیگر فقہی کتابوں میں موجود ہے۔

احکام کفر کے جاری و شائع ہونے کا کیا مطلب ہے؟ اس کی وضاحت کرتے ہوئے شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ لکھتے ہیں:

احکام کفر کے جاری ہونے سے یہ مراد ہے کہ مقدمات، انتظامِ سلطنت و بندوبست رعایا، وتحصیل خراج وعشر، اموالِ تجارت، اور ڈاکوؤں اور چوروں کی سزا اور رعایا کے باہمی معاملات اور جرموں کی سزا کے مقدمات میں کفار کا حکم جاری ہو۔ اگر چہ بعض احکام اسلام مثلاً جمعہ وعیدین و اذان اور گاؤکشی میں کفار تعرض نہ کریں۔

(فتاویٰ عزیزی ،ص۴۲۱)

فقہاء کے مختلف اقوال میں مطابقت پیدا کرتے ہوئے شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ مزید لکھتے ہیں: اصح اور ارجح یہ قول ہے کہ جب تک اہلِ اسلام اور کفار سے لڑائی قائم رہے، اور اہل اسلام اپنے ملک پر قبضہ وتصرف کر لینے سے عاجز ہو کر فرمانبردار نہ ہو جائیں، اور کفار کا اس قدر غلبہ نہ ہو جائے کہ شعائرِ اسلام سے جو چاہیں موقوف کر دیں اور مسلمان بلا ان کی پناہ کے خود اپنے طور پر مقیم رہیں اور اہل اسلام اپنی ملکیت پر بطور خود متصرف رہیں، کفار کی اجازت کی ضرورت نہ ہو اس وقت وہ ملک دارالاسلام رہتا ہے، اور دارالحرب نہیں ہوتا۔ اور کفار کے تصرفات عارضی قابل لحاظ نہیں۔ اسلام کا تسلط ہو جانے کے بعد ان تصرفات کا اعتبار نہیں۔

جب اہل اسلام کی شکست ہو جائے اور فرمانبردار ہو جائیں اگر چہ اس فکر میں ہوں کہ سامان جنگ مہیا کریں لیکن مقابلہ سے عاجز ہو گئے ہوں اور کفار کی اجازت سے وہاں سکونت پزیر ہوں ، اور کفار کی اجازت سے اپنی ملکیت میں تصرف کرتے ہوں اور شعائر اسلام صرف اس وجہ سے جاری ہوں کہ کفار کو تعصب نہ ہو اور اس وجہ سے وہ منع نہ کرتے ہوں ، اہل اسلام کی قوت سے شعائر اسلام جاری نہ ہوں تو وہ ملک دارالحرب ہو جاتا ہے ۔

(فتاوی عزیزی ص ۵۴۸)

بہر حال اصل چیز غلبہ اور اقتدار ہے ۔ جب کفار دارالاسلام کے کسی حصّے پر قابض اور متصرف ہو جائیں اور ان کا حکم جاری ہو جائے تو وہ علاقہ دارالحرب ہو جائے گا ۔

جہاں امام مسلمین کا حکم جاری نہ ہو بلکہ کفار کا حکم چل رہا ہو، وہاں بعض احکام اسلام سے تعرض نہ ہونا لا حاصل ہے ۔ محض جمعہ وعیدین یا اذان و ذبح بقر کی آزادی ایسی سرزمین کو دارالاسلام نہیں بنا سکتی ۔

دارالعہد

فقہائے اسلام کی علمی اصطلاح میں دارالعہد سے مراد ایسا علاقہ ہے جو دارالاسلام کے امام وقت یا اس کے نائب کے ساتھ بعض شرائط پر امن اور صلح کا معاہدہ طے کرے ۔

(اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج۹ ص ۱۳۳)

بعض فقہاء خصوصاً شوافع نے دارالعہد یا دار الصلح کو دار الحرب اور دار الاسلام سے الگ ایک تیسری عارضی حیثیت دی ہے ۔ لیکن باقی فقہاء خصوصاً احناف اس کو الگ کوئی حیثیت نہیں دیتے ۔ ان کی رائے یہ ہے کہ جب کسی علاقے کے باشندوں نے معاہدہ کر لیا اور خراج یا جزیہ دینے پر آمادہ ہو گئے تو سمجھنا چاہئے کہ وہ دارالاسلام کا جزو بن گئے ، اور انہیں امام کی طرف سے حفاظت کا حق حاصل ہو گیا ۔ حنفی فقہاء اہل العہد اور اہل الصلح کو اہل الذمہ

یا ذمی شمار کرتے ہیں۔مولانا مودودی اپنی کتاب سود میں لکھتے ہیں:

معاہد کفار اگر چہ نظری حیثیت سے حربی ہیں اور ان کے ملک پر دار الحرب کا اطلاق ہوسکتا ہے، مگر جب تک اسلامی حکومت نے ان سے معاہدانہ تعلقات قائم رکھے ہیں وہ مباح الدم والاموال نہیں ہیں اور ان کی جان و مال سے تعرض کرنا شرعاً ممنوع ہے۔ اگر کوئی مسلمان ان کا خون بہائے گا تو دیت لازم آئے گی، اور اگر ان کے مال سے تعرض کرے گا تو ضمان دینا ہوگا۔

(سود۔ص۴۲۹)

طے شدہ شرائط کے مطابق جب معاہدہ ہو جائے تو دار العہد کے خلاف کسی قسم کی جنگی کاروائی جائز نہیں۔ اور جب تک دار الصلح کے باشندے مقررہ شرائط کی پابندی کرتے رہیں اس وقت تک ان سے کسی قسم کا تعرض جائز نہیں۔لیکن جب وہ کسی شرط کی خلاف ورزی کریں تو اس وقت ان کا ملک دار الصلح نہیں رہے گا بلکہ دار الحرب بن جائے گا، اور ان سے کیا ہوا معاہدۂ صلح ختم ہو جائے گا۔ اس صورت میں معاہدہ ختم ہونے کی اطلاع انہیں دینی ضروری ہے تاکہ انہیں بھی معلوم ہو جائے کہ معاہدہ اب باقی نہیں ہے۔

جو لوگ بار بار بدعہدی کریں اور جن کے عہد و اقرار کا کوئی اعتبار نہ رہے اور جو مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں اخلاق و انسانیت کے کسی آئین کا لحاظ نہ رکھیں ان سے دائمی جنگ کا حکم ہے اور صرف اسی صورت میں ان سے صلح ہوسکتی ہے کہ وہ توبہ کریں اور اسلام لے آئیں، ورنہ ان کے اثر سے اسلام اور دار الاسلام کو محفوظ رکھنے کے لئے قتل، گرفتاری محاصرہ اور ایسی ہی دوسری جنگی تدابیر اختیار کرتے رہنا ضروری ہے۔

(الجہاد فی الاسلام۔ص۶۹)

دار الحرب سے
دار الاسلام کی
طرف ہجرت

دارالحرب سے دارالاسلام کی طرف ہجرت

ہجرت کی تعریف

اسلام کی اصطلاح میں دارالاسلام کی سکونت اختیار کرنے کی غرض سے دارالحرب کی سکونت ترک کرنے کو ہجرت کہتے ہیں جیسا کہ درج ذیل تصریحات سے ظاہر ہے۔ فتح الباری میں ہے:

الهجرة هی الخروج من دار الحرب الیٰ دار الاسلام ۔

ہجرت سے مراد دارالحرب سے دارالاسلام کی طرف نکلنا ہے۔

(فتح الباری، ج٦،ص٣٧٩)

ملاعلی قاری مرقات میں لکھتے ہیں:

الهجرة ای الانتقال من دار الکفر الیٰ دار الاسلام ۔

ہجرت یعنی دارالکفر سے دارالاسلام کی طرف منتقل ہونا۔

(مرقاۃ المفاتیح، ج٧،ص٢١٥)

نواب صدیق حسن خان لکھتے ہیں:

الهجرة فی الشرع بمعنی الخروج من دار الکفر الیٰ دار الاسلام ۔

اصطلاح شرع میں ہجرت کا معنیٰ دارالکفر سے دارالاسلام کی طرف نکلنا ہے۔

(الدین الخالص، ج٣،ص١٢٤)

ہجرت کا حکم

فقہاء نے ہجرت کی دو قسمیں بیان کی ہیں، ایک واجب اور دوسری مستحب ۔

واجب ہجرت کونسی ہے اس کے متعلق ابن جوزی زادالمیسّر میں لکھتے ہیں:

1) من تجب عليه وهو الذى لايقدر علىٰ اظهار الاسلام فى دار الحرب خوفاً علىٰ نفسهٖ وهو قادر على الهجرة فتجب عليه ۔

یعنی جس دارالحرب میں مسلمان اظہارِ اسلام پر قادر نہ ہوں اور انہیں اپنی جان کا خوف ہو، اور وہاں سے ہجرت کرنے کی قدرت رکھتے ہوں تو ان کے لئے اس دارالحرب سے ہجرت کرنا واجب ہے۔

2) من لا تجب عليه بل تستحب له ، وهو من كان قادرا علىٰ اظهار دينه فى دار الحرب۔

جس دارالحرب میں مسلمان اپنے دین کے اظہار پر قادر ہوں وہاں سے ہجرت کرنا واجب نہیں بلکہ مستحب ہے۔

(زاد المیسر فی علم التفسیر.ج۲.ص۱۵۶)

شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ فتاویٰ عزیزی میں لکھتے ہیں:

جس دارالحرب سے ہجرت کرنا فرض ہے اس سے مراد وہ دارالحرب ہے کہ کفار حربی وہاں کے باشندوں کو اظہار اسلام وروزہ ونماز وجمعہ وجماعت واذان وختنہ کرنے سے منع کریں۔ اور اگر ایسا نہ ہو بلکہ وہاں کے مسلمان اظہارِ اسلام بے تامل کرتے ہوں تو ایسے دارالحرب سے ہجرت کرنا فرض نہیں ۔ اور بتقدیر وجوب بھی ہجرت فی الفور واجب نہیں ہوجاتی، بلکہ اُس وقت ہجرت واجب ہوگی جب کہ کوئی پناہ کی جگہ پائی جائے گی۔

(فتاوی عزیزی.ص۵۰۱)

مولانا مودودی تفہیم القرآن میں لکھتے ہیں:

جو شخص اللہ کے دین پر ایمان لایا ہو اس کے لئے نظام کفر کے تحت زندگی بسر کرنا

صرف دو ہی صورتوں میں جائز ہوسکتا ہے، ایک یہ کہ وہ اسلام کو اس سرزمین میں غالب کرنے اور نظام کفر کو نظام اسلام میں تبدیل کرنے کی جدوجہد کرتا رہے، جس طرح انبیاء علیہم السلام اور ان کے ابتدائی پیرو کرتے رہے۔

دوسرے یہ کہ وہ درحقیقت وہاں سے نکلنے کی کوئی راہ نہ پاتا ہو، اور سخت نفرت و بے زاری کے ساتھ وہاں مجبورانہ قیام رکھتا ہو۔ ان دو صورتوں کے سوا ہر صورت میں دارالکفر کا قیام ایک مستقل معصیت ہے، اور اس معصیت کے لئے یہ عذر کوئی بہت وزنی نہیں ہے کہ ہم دنیا میں کوئی ایسا دارالاسلام پاتے ہی نہیں ہیں جہاں ہم ہجرت کر کے جا سکیں۔ اگر کوئی دارالاسلام موجود نہیں تو کیا خدا کی زمین میں کوئی پہاڑ یا کوئی جنگل بھی ایسا نہیں ہے جہاں آدمی درختوں کے پتے کھا کر اور بکریوں کا دودھ پی کر گزر کر سکتا ہو، اور احکام کفر کی اطاعت سے بچا رہے۔

(تفہیم القرآن ج۱ ص ۳۸۷)

بعض فقہا کا اس بات پر اصرار ہے کہ ہجرت کی قدرت رکھنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ کسی خطّہ پر دارالاسلام کا وجود بھی ہو، اور دارالاسلام نے مہاجرین کے لئے اپنے دروازے کھول رکھے ہوں۔ لیکن بعض دوسرے علماء ہجرت کے لئے کسی دارالاسلام کی موجودگی کو ضروری نہیں سمجھتے، بلکہ ان کے نزدیک مسلمان کے لئے احکام کفر کی اطاعت سے بچنے کے لئے اگر اُسے کسی پہاڑ یا جنگل میں ایسا مقام میسّر آسکے جہاں وہ دین کے تقاضے پورے کر سکے تو اُسے وہاں بھی ہجرت کر جانا چاہیئے۔

مولانا بدر عالم میرٹھیؒ ترجمان السنۃ میں لکھتے ہیں:

دارالحرب کی سکونت مسلمان کے لئے موزوں نہیں، لیکن واضح رہے کہ دارالاسلام کی طرف ہجرت کا سوال اُسی وقت پیدا ہوسکتا ہے جبکہ کسی خطّہ پر دارالاسلام کا وجود بھی ہو،

اور اس کی طرف ہجرت کرنا ممکن بھی ہو، لیکن اگر بدنصیبی سے صفحۂ ہستی پر دار الاسلام کا وجود ہی نہ رہے، یا مسلمانوں کی مسلسل غفلت کی وجہ سے دار الحرب میں ان کی تعداد اتنی زیادہ ہو جائے کہ دار الاسلام میں ان کی کھپت کا امکان ہی نہ ہوتو اب ہجرت کا سوال ہی باقی نہیں رہتا۔ان حالات میں مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اپنے ہی ماحول میں رہ کر ایسی فضا پیدا کرنے کی سعی میں لگے رہیں جس میں آئینِ اسلام پر عمل کرنے کی انہیں پوری آزادی حاصل ہو جائے ۔ اور جب تک آئین اسلام پر عمل کرنے میں کوئی ادانیٰ رکاوٹ باقی رہے اس وقت تک راحت کی نیند نہ لیں ۔

(ترجمان السنۃ.ج۲,ص۱۵۲)

اسی طرح مولانا مودودی تفہیم القرآن میں لکھتے ہیں :

دار الکفر کے رہنے والے کسی مسلمان کو محض ہجرت نہ کرنے پر منافق صرف اس صورت میں کہا جا سکتا ہے جبکہ دار الاسلام کی طرف سے ایسے تمام مسلمانوں کو یا تو دعوتِ عام ہو، یا کم از کم اس نے ان کے لئے دروازے کھلے رکھے ہوں ۔ اس صورت میں بلا شبہ وہ سب مسلمان منافق قرار پائیں گے جو دارلکفر کو دار الاسلام بنانے کی کوئی سعی بھی نہ کر رہے ہوں ، اور استطاعت کے باوجود ہجرت بھی نہ کریں ۔لیکن اگر دار الاسلام کی طرف سے نہ تو دعوت ہی ہو، اور نہ اس نے اپنے دروازے ہی مہاجرین کے لئے کھلے رکھے ہوں ،تو اس صورت میں صرف ہجرت نہ کرنا کسی شخص کو منافق نہ بنا دے گا ، بلکہ وہ منافق صرف اس وقت کہلائے گا جب کہ فی الواقع کوئی منافقانہ کام کرے ۔

(تفہیم القران .ج۱,ص۳۷۹)

مولانا امین احسن اصلاحی ہجرت کے ضمن میں لکھتے ہیں :

جب کہ صالحین نہایت حقیر اقلیّت میں ہوں اور مفسدین سے ٹکر لینے کی صورت

میں ان کو کوئی نقصان پہنچانے کے بجائے خود ان کی اپنی تباہی کا اندیشہ ہو۔ علاوہ ازیں کوئی ایسا دار الاسلام موجود ہو جس کے دروازے ان کے لئے کھلے ہوں، اور جہاں وہ اسلامی ماحول کے اندر اپنے دینی تقاضوں کے مطابق زندگی بسر کر سکتے ہوں اس صورت میں بہتر یہی ہے کہ وہاں سے ہجرت کر کے وہ دار الاسلام میں منتقل ہو جائیں، کیونکہ مسلمان کے لئے یہ بات جائز نہیں کہ ایک دینی ماحول کے موجود ہوتے ہوئے کسی ایسے ماحول میں اپنے آپ کو رکھ چھوڑے جہاں بجائے اس کے کہ وہ اُس ماحول کو متأثر کرے، اندیشہ ہے کہ وہ ماحول اس کے اور اس کی آل و اولاد کے دین اور ایمان کے لئے ایک مستقل فتنہ بن جائے۔ اگر ہجرت کی استطاعت اور دار الاسلام کی موجودگی کے باوجود کوئی شخص اپنے آپ کو دار الکفر کی آلودگیوں میں مبتلا رکھے تو آخرت میں اس کا حشر کفّار ہی کے ساتھ ہوگا۔

(ماہنامہ ترجمان القرآن، مارچ 1950سنۂ، ص ۵۴)

جہاں ہجرت نہ کرنے والوں کو اس قدر سخت وعید سنائی گئی ہے، وہاں ہجرت کی نیت سے گھر سے نکل کھڑے ہونے والوں کو اجرِ عظیم کی بشارت دی گئی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ آدمی دار الہجرت میں پہنچ ہی جائے بلکہ صرف یہ کافی ہے کہ ہجرت کے ارادے سے آدمی گھر سے نکل کھڑا ہو۔ جو گھر سے نکل کھڑا ہوا اگر فوراً ہی اس کی موت آ گئی تو اس سے اس کے اجر میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔

☆☆☆☆☆

دار الاسلام

کا دفاع

دارالاسلام کا دفاع

جہاد

دار الاسلام اور دار الحرب میں تصادم نا گزیر ہے اس لئے دار الاسلام کے دفاع کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔دار الاسلام آزاد وخودمختا ہوتب ہی وہاں اسلام کے احکام جاری ہو سکتے ہیں،اور مسلمان اپنے مذہبی فرائض سر انجام دے سکتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ دار الاسلام کی مدافعت کے لئے تمام مسلمانوں پر جہاد فرض ہو جاتا ہے۔فقہ کی تمام کتابوں میں یہ حکم موجود ہے کہ جب دشمن دار الاسلام پر حملہ کرے تو ہر مسلمان پر فرداً فرداً دفاع کا فرض ایسی قطعیت کے ساتھ عائد ہو جاتا ہے جیسے نماز اور روزہ۔

(الجہاد فی الاسلام ص۱۵۷)

فقہ کی مشہور کتاب بدائع الصنائع میں لکھا ہے:

اما اذا عم النفير بان هجم العدو علىٰ بلد فهو فرض عين يفترض علىٰ كل واحد من احاد المسلمين ممن هو قادر عليه -----

فاذا عم النفير لا يتحقق القيام به الا بالكل ، فبقى فرضا على الكل عينا بمنزلة الصوم والصلوة ، فيخرج العبد بغير اذن مولاه ، والمرأة بغير اذن زوجها ، لان منافع العبد والمرأة فى حق العبادات المفرووضة عينامستثناه عن ملك المولىٰ والزوج شرعا، كما فى الصوم والصلوٰة ، وكذا يباح للولد ان يخرج بغير اذن والديه ، لان حق الوالدين لا يظهر فى فروض الاعيان كالصوم والصلوٰة۔

(بدائع الصنائع ،ج ۷،ص ۹۸)

مگر جب اعلان عام ہو جائے کہ دشمن نے ایک اسلامی ملک پر حملہ کیا ہے تو پھر جہاد فرض عین ہو جاتا ہے ، اور ہر مسلمان پر جو جہاد کی قدرت رکھتا ہو فرداً فرداً اس کی فرضیت عائد ہو جاتی ہے ۔۔۔

نفیر عام ہونے کے بعد تو ادائے فرض کا حق بغیر اس کے پورا ہوتا ہی نہیں کہ سب کے سب جہاد کرنے کے لئے کھڑے ہو جائیں ،اس وقت وہ سب مسلمانوں پر اس طرح فرض عین ہو جاتا ہے جیسے روزہ اور نماز ، پس غلام کو بغیر آقا کی اجازت کے اور عورت کو بغیر اپنے شوہر کی اجازت کے نکلنا چاہئے ۔ کیونکہ ان عبادات میں جو فرض عین ہیں غلام اور بیوی کی خدمت آقا اور شوہر کی ملک سے مستثنیٰ ہے جیسے نماز اور روزہ ،اسی طرح بیٹے کے لئے مباح ہو جاتا ہے کہ وہ بغیر والدین کی اجازت کے نکل کھڑا ہو ، کیونکہ روزہ اور نماز جیسے فرض اعیان ہیں، والدین کا حق اثر انداز نہیں ہوسکتا ۔

(الجہاد فی الاسلام ،ص ۵۸)

تمام محدثین اور ائمہ فقہ نے جہاد کی فرضیت کی دو قسمیں بیان کی ہیں ۔ ایک فرض عین اور دوسری فرض کفایہ۔اگر دشمن دارالاسلام کے کسی علاقے پر خواہ وہ آباد ہو یا غیر آباد ، صحرا ہو یا پہاڑ ،حملہ کر دیں تو اس علاقے کے مسلمانوں پر دشمن کے خلاف جہاد کرنا فرضِ عین ہو جاتا ہے ۔اگر وہ دشمن کے دفاع کی استطاعت نہ رکھتے ہوں تو متصل علاقوں کے مسلمانوں پر اس کی مدافعت فرض عین ہے ۔ اور اگر وہ بھی ناکافی ثابت ہو رہے ہوں تو مشرق ومغرب کے تمام مسلمانوں پر دارالاسلام کے اس حصّے کا دفاع لازم ہے ۔اور دشمن کے تسلط سے اس کا آزاد کرانا فرض عین ہے ، جو شخص بلا عذرِ شرعی اس فرض کے قیام سے جی چرائے گا وہ سخت گناہ گار ہوگا ، اور اس کے تمام اچھے اعمال غارت ہو جائیں گے ۔

(جہاد اسلامی ،ص ۶۹)

فقہ کی مشہور کی کتاب ردالمختار میں ہے:

ان الجهاد اذا جاء النفير انما يصير فرض عين ، على من يقرن من العدو ، فاما من وراء هم ببعد من العدو فهو فرض كفاية عليهم حتّٰى يسعهم تركه اذا لم يحتج اليهم ، فان احتيج اليهم بان عجز من كان يقرب من العدو وعن المقاومة مع العدو ، اولم يعجزوا عنها لكنهم تكاسلوا ولم يجاهدوا فانه يفترض على من يليهم فرض عين كالصلوٰة والصوم لا يسعهم تركه ، ثمّ و ثمّ الى ان يفترض على جميع اهل الاسلام شرقا و غربا على هذا التدريج۔

(رد المختار ج۴ ص۱۲۴)

واقعہ یہ ہے کہ جب نفیر ہوتو جہاد فرض عین صرف ان لوگوں پر ہوتا ہے جو دشمن سے قریب ہوں، رہے وہ لوگ جو دشمن سے دور ہوں تو ان پر فرض کفایہ رہتا ہے، یعنی اگر ان کی مدد کی ضرورت نہ ہوتو وہ شرکتِ جہاد سے باز بھی رہ سکتے ہیں، لیکن اگر ان کی مدد کی ضرورت پڑ جائے خواہ اس وجہ سے کہ جو لوگ دشمن سے قریب تھے وہ مقابلے سے عاجز ہو گئے، یا اس وجہ سے کہ وہ عاجز تو نہ ہوئے مگر انہوں نے سستی کی، اور پوری کوشش سے مقابلہ نہ کیا تو اس صورت میں جہاد آس پاس کے لوگوں پر ویسے ہی فرض عین ہوجاتا ہے جیسے نماز اور روزہ، کہ اُسے چھوڑنا کسی طرح جائز نہیں ہوسکتا۔ پھر ان لوگوں پر جو ان سے قریب ہوں، پھر ان پر جو ان سے قریب ہوں، یہاں تک کہ از شرق تا غرب تمام اہل اسلام پر اسی تدریج کے ساتھ فرض ہوتا چلا جاتا ہے۔

(الجہاد فی الاسلام ص۵۹)

دارالاسلام کو دشمن سے بچانے کا سوال جب پیدا ہو جائے تو قرآن کی رو سے اس

وقت مسلمان کی صداقتِ ایمانی کا فیصلہ ہی اس بات پر ہوگا کہ وہ مدافعت میں اپنی جان اور مال کی قربانی دینے کے لئے تیار ہوتا ہے یا نہیں، جو شخص اس آڑے وقت میں جی چرائے، اور جان و مال کی قربانی سے دریغ کرے اس کی نماز اور اس کے روزے سب بیکار ہیں۔

مسلمانوں کی قومی آزادی اسلام کی نگاہ میں بنادی اہمیت رکھتی ہیں، اس آزادی کو جب خطرہ لاحق ہو جائے تو اس وقت دوسری تمام چیزیں اپنی اہمیت میں کمتر ہو جاتی ہیں، اور سب سے بڑھ کر اہمیت اس چیز کو حاصل ہو جاتی ہے کہ اس آزادی کی حفاظت کی جائے، کیونکہ مسلمانوں کا اسلامی زندگی بسر کرنا اسی پر موقوف ہے۔ مسلمان اپنے ملک میں آزاد و خودمختار ہو کر رہیں تب ہی تو وہ اس قابل ہو سکیں گے کہ اسلام کے احکام ان کے ہاں جاری ہوں، اور وہ مسلمان کی طرح زندگی بسر کریں۔

اگر ان کی یہ آزادی وخودمختاری ہی ختم ہو جائے تو اس کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا کہ ان کا ملک دارالاسلام بن کر رہ سکے۔ اسی بنا پر قرآن یہ فیصلہ کرتا ہے کہ وہ شخص اپنے ایمان کے دعوے میں جھوٹا ہے جو دارالاسلام کی ہستی کو خطرہ لاحق ہو جانے کی صورت میں اپنی جان ومال کی خیر منائے، اور اس خطرے کو رفع کرنے میں کسی قسم کی قربانی کرنے سے جی چرائے۔

(ہفت روزہ آئین، ۲۳ ستمبر ۱۹۶۵ء، ص ۴)

جہاد کی ذمہ داری صرف ان لوگوں پر ہی عائد نہیں ہوتی جنہیں میدان جنگ میں دشمن کے مقابلے پر لڑنے کا حکم ملتا ہے۔ بلکہ اس کے لئے ہر اس شخص کو اپنا تن، من، دھن ہر وقت قربان کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے، جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہے۔

دارالاسلام پر حملہ کی صورت میں جہاد پوری ملّت پر فرض ہو جاتا ہے۔ جن لوگوں کو دشمن سے لڑنے کے احکام صادر ہو جائیں انہیں یہ فرض میدان جنگ میں بڑی ثابت قدمی

سے ادا کرنا چاہئے ، اور باقی امّت کو نہ صرف ان جانثاروں کی ذمّہ داریاں سنبھالنی چاہئیں بلکہ وہ تمام تدابیر اختیار کرنی چاہئیں جن سے انہیں تقویت حاصل ہو۔

(ماہنامہ ترجمان القرآن ,اکتوبر 1965 ,ص15)

حملہ کی صرف یہی ایک صورت نہیں ہے کہ ایک سلطنت باقائدہ اعلان جنگ کر کے دارالاسلام پر حملہ آور ہو، اور اس کو فتح کر کے مسلمانوں کو مٹانے یا غلام بنانے ، یا ان کی مذہبی آزادی کو سلب کرنے کی کوشش کرے، بلکہ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی صورتیں ہیں ، جن سے ایک قوم کے امن و اطمینان اور اس کی اجتماعی زندگی کو خطرے میں مبتلا کیا جا سکتا ہے۔

(الجہاد فی الاسلام,ص ۶۱)

علمائے اسلام نے قتال فی سبیل اللہ کے شرعی مواقع کو تین عنوانات کے تحت تقسیم کیا ہے ۔(1) جب کفّار یا دشمنان اسلام دارالاسلام پر حملہ کر کے مسلمانوں کا استیصال کرنے کے درپے ہو جائیں ۔

(2) جب دارالکفر میں رہنے والے،آزادمسلمانوں کی مدد کے طالب ہوں ۔

(3) جب کوئی حکومت یا معاشرتی گروہ اپنے ماتحت ، یا زیراثر باشندوں پر جبر یا دوسرے حیلوں سے طلب حق کے راستے مسدود کر دے ، اور ایسے حالات پیدا کر دے کہ اگر اس کے باشندے چاہیں تب بھی ان تک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی آواز نہ پہنچ سکے ۔

(رسول اللہ میدان جہاد میں,ص۲۳۴)

اگر مسلمانوں پر ظلم ہو یا دارالاسلام پر مشرکین اور کفار چڑھ دوڑیں تو اس صورت میں امام وقت اعلان جہاد کرے گا ۔ اور جہاد بالسیف فرض ہو جائے گا ۔اگر وہ صلح پر آمادہ ہو جائیں تو صلح کرنے کا حکم ہے ۔ اگر کوئی ایسی صورت ہو کہ کفّار و مشرکین فتنے کا باعث بن سکتے ہوں تو اُن پر حملہ کر کے ان کی سرکوبی کر دینا ضروری ہے ۔

الماوردی نے صراحت سے لکھا ہے کہ اگر داخلی طور پر دار الاسلام کو خطرہ ہو تو اس وقت بھی جہاد فرض ہے ، مثلاً کوئی گروہ یا خطّہ دار الاسلام کی مرکزی قانونی حکومت کو چیلنج کرتے ہوئے فرائض اسلام یا بیت المال کے واجبات ادا کرنے سے انکار کرے ، جیسا کہ حضرت ابو بکرؓ نے مانعین زکوٰۃ اور مرتدین کے خلاف جہاد کا حکم دیا تھا ، تو اس صورت میں بھی جہاد فرض ہے ۔

(اردو دائرہ معارف الاسلامیہ ۔ج۹۔ص۱۰۲)

قرآن و سنت میں دار الاسلام کی فوجی طاقت اور دفاعی قوت کے استحکام پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے :

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ۔ (سورۃ انفال ، آیت ٦١)

اور ان کے لئے جتنی قوت تم سے ممکن ہو سکے فراہم کر رکھو ۔

اسی طرح دار الاسلام کی حفاظت کے لئے سرحدی مقامات اور بندرگاہوں پر حفاظتی فوجیں بیٹھانا بھی ضروری ہے ۔ اس کے لئے رباط کا لفظ استعمال ہوتا ہے ۔ شرعی اصطلاح میں رباط سے مراد دار الاسلام کی ان آخری سرحدوں کی مدافعت اور حفاظت ہے جو دار الکفر سے ملتی ہوں ۔ ان سرحدوں اور سرحدوں سے متّصل علاقوں کی حفاظت اسلامی حکومت کی مستقل ذمہ داری ہے ۔ چونکہ یہ علاقے ہمیشہ دشمن کی زد میں رہتے ہیں ، اور ہر وقت ان پر دشمن کے حملے کا خطرہ رہتا ہے ، اس لئے ان کے تحفظ اور دفاع کے لئے مرابطین کے مضبوط دستے درکار ہیں ۔

(جہاد اسلامی ۔ص۱۷۰)

جہاد کی ضرورت اور اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اسلامی قانون کی رو سے اگر کوئی مسلمان کفّار کی قید میں ہو تو اس کا چھڑانا مشرق و مغرب کے تمام مسلمانوں پر

فرض ہے۔فتاویٰ بزازیہ میں ہے:

امرأة مسلمة سبيت بالمشرق وجب على اهل المغرب تخليصها۔

اگر ایک مسلمان عورت کبھی گرفتار ہوگئی ہوتو اہل مشرق ومغرب پر اسے رہا کرانا واجب ہے۔

(فتاوي بزازيه. كتاب السير على هامش الفتاوي الهنديه. ج٦ص٣٠٨)

سید قطب شہید اپنی کتاب معالم فی الطریق میں لکھتے ہیں:

و حقيقة ان حماية دار الاسلام حماية للعقيدة ، والمنهج والمجتمع الذى يسود فيه المنهج، ولكنها هى ليست الهدف النهائى ، وليست حمايتها هى الغاية الاخيرة لحركت الجهاد الاسلامى ، انما حمايتها هى الوسيلة لقيام مملكة الله فيها ، ثم لاتحاذها قاعدة انطلاق الى الارض كلها ، و الى النوع الانسانى بجملته۔

بلا شبہ دارالاسلام کا تحفظ اور دفاع خود عقیدۂ اسلام کا دفاع ہے۔اسلامی نظام حیات اور اسلام کے نمائندہ معاشرے کا دفاع ہے،لیکن دفاع کو اصل اور آخری مقصد نہیں قرار دیا جا سکتا،اور نہ دارالاسلام کا تحفظ ہی اسلام کی تحریک جہاد کی اصل غایت ہے، بلکہ دارالاسلام کی حفاظت تو خدا کی حکومت کے قیام کا ایک ذریعہ ہے۔

اور ثانیاً اس کی وجہ یہ ہے کہ دار الاسلام کو وہ مرکزی مقام بنانا مقصود ہوتا ہے کہ جہاں سے اسلام کا آفتاب جہاں تاب دنیا کے کونے کونے میں چمکے،اورنوع انسانی اس کے اعلان آزادی سے متمتع ہو۔

(معالم فى الطريق.ص٦٧)

دارالاسلام کی خارجہ پالیسی

دارالاسلام کی خارجہ پالیسی

حربی

اسلامی قانون کا یہ شعبہ ان مسائل سے بحث کرتا ہے جو ارضی تفریق یا اختلاف دارین سے نفوس اور اموال کے بارے میں پیدا ہوتے رہیں۔

دار الحرب کے باشندوں کی دو قسمیں ہیں، حربی اور مسلمان۔ حربی دار الحرب کے وہ باشندے ہیں جو اسلام پر ایمان نہ رکھتے ہوں، اور حربیوں کا حکم یہ ہے کہ ان کو اسلام کی جانب سے کوئی تحفّظ حاصل نہیں ہے، اور ان کے اور دارالاسلام کے درمیان اگر کوئی معاہدہ نہ ہو تو اُن کا جان و مال مباح ہے۔ حربی کافروں کی عورتیں، ان کے بچے، ان کے بیمار، اُن کے بوڑھے اور اپاہج وغیرہ بھی اگرچہ حربی ہیں، مگر شریعت نے ان کو مباح دم نہیں ٹھرایا ہے، بلکہ اباحت قتل کو صرف مقاتلین تک محدود رکھا ہے۔ قتل صرف وہ کیا جائے گا جو ہم سے مقاتلہ کرے، کیونکہ اللہ تعالٰی نے "وَقَاتِلُوْهُمْ" (مقاتلہ کرو) فرمایا ہے۔ اور مقاتلہ جانبین سے ہوتا ہے، نہ کہ صرف ایک جانب سے۔

(سود. ص۴۳۵)

اگر مستأمن جو دارالاسلام میں آیا تھا دارالحرب کو لوٹ جائے تو مثل اور حربیوں کے اس کا بھی خون مباح ہو گیا۔ جہاد میں مثل اور حربیوں کے اُس کو بھی قتل کریں گے۔ اگر ذمّی دارالحرب میں مستقل اقامت اختیار کرے تو وہ بھی حربی ہو جائے گا۔

دارالحرب کے مسلمان

جو مسلمان دارالاسلام میں ہجرت کر کے نہ آئے، بلکہ دار الحرب میں رہنا قبول

کریں، یا رہنے پر مجبور ہو، اُن سے دارالاسلام کے مسلمانوں کے تمدّنی اور سیاسی تعلقات نہیں رہ سکتے ۔قرآن مجید میں ہے :

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا ۚ (سورۃ الانفال ،آیت ۷۲)

اور جولوگ ایمان تو لے آئے لیکن ہجرت نہیں کی تو جب تک وہ ہجرت نہ کریں تم کو ان کی رفاقت سے کچھ سروکار نہیں۔

یہ آیت اسلام کے دستوری قانون کی ایک اہم دفعہ ہے ۔اس میں یہ اصول مقرر کیا گیا ہے کہ ولایت کا تعلق صرف ان مسلمانوں کے درمیان ہوگا جو یا تو دار الاسلام کے باشندے ہوں ، یا اگر باہر سے آئے تو ہجرت کر کے آجائیں ۔ باقی رہے وہ مسلمان جو اسلامی ریاست کے حدود ارضی سے باہر ہوں تو ان کے ساتھ مذہبی اخوت تو ضرور قائم رہے گی لیکن ولایت کا تعلق نہیں ہوگا ۔اوراسی طرح ان مسلمانوں سے بھی یہ تعلقِ ولایت نہ رہے گا جو ہجرت کر کے نہ آئیں ، بلکہ دار الکفر کی رعایا ہونے کی حیثیت سے دار الاسلام میں آئیں۔

ولایت کا لفظ عربی زبان میں حمایت ،نصرت ،مددگاری پشت بانی، دوستی،قرابت، سرپرستی اور اس سے ملتے جلتے مفہومات کے لئے بولا جاتا ہے ۔ اور اس آیت کے سیاق و سباق میں صریح طور پر اس سے مراد وہ رشتہ ہے جو ایک ریاست کا اپنے شہریوں سے اور شہریوں کا اپنی ریاست سے، اورخودشہریوں کا آپس میں ہوتا ہے ۔

پس یہ آیت دستوری وسیاسی ولایت کو اسلامی ریاست کے ارضی حدود تک محدود کر دیتی ہے، اور ان حدود سے باہر کے مسلمانوں کو اس مخصوص رشتہ سے خارج قرار دیتی ہے ۔

اس عدم ولایت کے قانونی نتائج بہت وسیع ہیں ۔ اسی عدم ولایت کی بنا پر دارالکفر اور دار الاسلام کے مسلمان ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے ، ایک دوسرے کے قانونی ولی نہیں بن سکتے ، باہم شادی بیاہ نہیں کر سکتے ، اور اسلامی حکومت کسی ایسے مسلمان کو اپنے ہاں ذمّہ داری کا منصب نہیں دے سکتی جس نے دارالکفر سے شہریت کا تعلق نہ توڑا ہو۔

علاوہ ازیں یہ آیت اسلامی حکومت کی خارجی سیاست پر بھی اثر ڈالتی ہے۔ اس کی رو سے دولت اسلامیہ کی ذمّہ داری ان مسلمانوں تک محدود ہے جو اس کی حدود کے اندر رہتے ہیں ۔ باہر کے مسلمانوں کے لئے کسی ذمّہ داری کا بار اس کے سر نہیں ہے۔ یہی وہ بات ہے جو نبی کریم ﷺ نے اس حدیث میں فرمائی ہے کہ:

اَنَا بَرِيْئٌ مِّنْ كُلِّ مُسْلِمٍ بَيْنَ ظَهْرَانِى الْمُشْرِكِيْن ۔ (ابو داؤد)

میں کسی ایسے مسلمان کی حمایت وحفاظت کا ذمّہ دار نہیں ہوں جو مشرکین کے درمیان رہتا ہو۔

اس طرح اسلامی قانون نے اس جھگڑے کی جڑ کاٹ دی ہے جو بالعموم بین الاقوامی پیچیدگیوں کا سبب بنتا ہے ۔ کیونکہ جب کوئی حکومت اپنے حدود سے باہر رہنے والی بعض اقلیتوں کا ذمہ اپنے سر لیتی ہے تو اس کی وجہ سے ایسی الجھنیں پڑ جاتی ہیں جن کو بار بار کی لڑائیاں بھی نہیں سلجھا سکتیں ۔

(تفہیم القرآن ۔ج ۲۔ص ۱۶۱)

ایک مسلمان دار الحرب میں اقامت رکھتا ہے ، اور اس نے قطعاً دار الاسلام کی جانب ہجرت نہیں کی تو امام مالکؒ ، امام شافعیؒ ، اور امام احمدؒ کے نزدیک وہ دار الاسلام کے مسلمانوں ہی کی طرح ہے ، اور اسے جان ومال کا تحفظ حاصل ہے ، اگر چہ وہ دار الحرب ہی میں مقیم ہو ، اور اس کی مدّتِ اقامت طویل ہو چکی ہو۔ اور وہ اگر کسی وقت دار الاسلام آنا

چاہےتو اسے نہیں روکا جائے گا۔

امام ابوحنیفہؒ کی رائے یہ ہے کہ وہ مسلم جو دارالحرب میں مقیم ہو، اور دارالاسلام ہجرت نہ کرے وہ صرف اسلام کی بنیاد پر محفوظ نہیں قرار دیا جا سکتا، کیونکہ مسلمان کو تحفظ مسلمانوں کی جمعیت، ان کی قوت اور شوکت اسلام سے حاصل ہوتا ہے۔ اور دارالحرب میں رہنے والے مسلمان کو نہ شوکت حاصل ہے اور نہ قوت، اس لئے اس کو تحفظ بھی حاصل نہیں ہے۔ البتہ یہ ہے کہ وہ جب چاہے دارالاسلام میں آ جائے۔ جس وقت وہ دارالاسلام میں داخل ہو جائے گا اسے تحفظ حاصل ہو جائے گا۔

(اسلام کا فوجداری قانون، ج۱، ص۳۷۱)

مولانا مودودی امام ابوحنیفہؒ کی رائے کو ترجیح دیتے ہیں، چنانچہ وہ اپنی کتاب سود میں لکھتے ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ نے اپنی رائے کی تائید میں جو قانونی استدلال کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف قانونی حیثیات کے پیچیدہ و نازک فرق کو سمجھنے میں امام صاحب کا تفقہ کس قدر بڑھا ہوا تھا۔ ہم اس بیان کو نقل کرتے ہیں کیونکہ اس سے اصول قانون کے ایک اہم مسئلہ پر روشنی پڑتی ہے۔ فرماتے ہیں:

دارالاسلام کی حفاظت میں آنے سے پہلے محض اسلام سے جو عصمت ثابت ہوتی ہے وہ صرف امام کے حق میں ہے مگر احکام میں نہیں ہے۔ دیکھتے نہیں ہو اگر ان دونوں مسلمانوں میں سے ایک شخص دوسرے کا مال، یا جان تلف کر دے تو اس پر ضمان نہ ہوگا حالانکہ وہ ایسا کرنے میں گناہ گار ہوگا۔

بات دراصل یہ ہے کہ احکام میں عصمت صرف حدود دارالاسلام کے اندر ہونے سے ثابت ہوتی ہے، اور یہ حفاظت دار کے سبب سے ہے، نہ کہ دین کے سبب سے۔ دین تو حق شرع کے لحاظ سے صرف ان لوگوں کو روکتا ہے جو اس پر اعتقاد رکھتے ہوں، اور ان کو

نہیں روکتا جو اسے نہ مانتے ہوں۔بخلاف اس کے دار کی قوت سے آدمی کے مال کی حفاظت اس کے مقابلے میں بھی کی جاتی ہے جو اس کی حرمت کا اعتقاد رکھتا ہے، اور اس کے مقابلے میں بھی جو ایسا اعتقاد نہیں رکھتا۔پس گناہ ہونے کی حیثیت سے جو عصمت ثابت ہے اس کی بنا پر ہم نے کہا کہ ان کے لئے یہ فعل مکروہ ہے، اور قانون کے لحاظ سے عدم عصمت کی بنا پر ہم نے یہ کہا کہ اس کا لیا ہوا مال واپس کرنے کا حکم نہ دیا جائے گا، کیونکہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کا مال جب لیتا ہے تو محض لے لینے ہی کی وجہ سے اس کا مالک ہو جاتا ہے۔

یہاں امام صاحب نے اسلامی قانون کے تینوں شعبوں کی طرف اشارات کر دیئے ہیں۔اعتقادی قانون کے لحاظ سے مسلمان کا مال بلا لحاظ اس کے کہ وہ دارالاسلام میں ہو، یا دارالکفر میں، یا دارالحرب میں، بہر حال معصوم ہے، اور اس عصمت کا مال یہ ہے کہ اس کی بنا پر خدا کے مقرر کئے ہوئے طریق کے خلاف لینے والا گناہ گار ہوگا۔

دستوری قانون کے لحاظ سے دارالاسلام میں رہنے والے کافر کے مال کو جو عصمت حاصل ہے وہ دارالکفر میں رہنے والے مسلمان کو حاصل نہیں، اس لئے اگر دارالکفر کا کوئی دوسرا مسلمان اس کو حرام طریقے سے لے لے تو خدا کے ہاں گناہ گار ہوگا مگر دنیا میں اسلامی حکم جاری نہ ہوگا۔تعلقات خارجیہ کے قانون کی نگاہ میں کفار کے درمیان رہنے والا مسلمان اپنے تمدّنی حقوق اور واجبات کے لحاظ سے انہی کافروں کا شریک حال ہے۔

(سود۔ص ۴۶۴)

دار الاسلام سے باہر رہنے والے مسلمان سیاسی ولایت کے رشتے سے خارج ہونے کے باوجود دینی اخوت کے رشتے سے خارج نہیں ہیں۔اگر کہیں ان پر ظلم ہو رہا ہے، اور وہ اسلامی برادری سے تعلق کی بنا پر دار الاسلام کی حکومت اور اس کے باشندوں سے مدد مانگیں تو ان کا فرض ہے کہ اپنے ان مظلوم بھائیوں کی مدد کریں۔قرآن مجید میں ہے:

وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ★ (سورۃ الانفال، آیت ۷۲)

اور اگر وہ تم سے دین (کے معاملات) میں مدد طلب کریں تو تم کو مدد کرنی لازم ہے۔ مگر ان لوگوں کے مقابلے میں کہ تم میں اور ان میں (صلح کا) عہد ہو (مدد نہیں کرنی چاہئے) اور خدا تمہارے (سب) کاموں کو دیکھ رہا ہے۔

ان دینی بھائیوں کی مدد کا فریضہ اندھا دھند انجام نہیں دیا جائے گا بلکہ بین الاقوامی ذمّہ داریوں اور اخلاقی حدود کا پاس ولحاظ رکھتے ہوئے بھی انجام دیا جا سکے گا۔ اگر ظلم کرنے والی قوم سے دار الاسلام کے معاہدانہ تعلقات ہوں تو اس صورت میں مظلوم مسلمانوں کی کوئی اایسی مدد نہیں کی جا سکے گی جو ان تعلقات کی اخلاقی ذمہ داریوں کے خلاف پڑتی ہو۔

آیت میں معاہدہ کے لئے میثاق کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس کا مادہ وثوق ہے جو عربی زبان کی طرح اردو زبان میں بھی بھروسے اور اعتماد کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ میثاق ہر اس چیز کو کہیں گے جس کی بنا پر کوئی قوم بطریق معروف یہ اعتماد کرنے میں حق بجانب ہو کہ ہمارے اور اس کے درمیان جنگ نہیں ہے۔ قطع نظر اس کے کہ ہمارا اس کے ساتھ صریح طور پر عدم محاربہ کا عہد و پیمان ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔

پھر آیت میں "بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ" کے الفاظ ارشاد ہوئے ہیں، یعنی تمہارے اور ان کے درمیان معاہدہ ہو۔ اس سے یہ صاف مترشح ہوتا ہے کہ دارالاسلام کی حکومت نے جو معاہدانہ تعلقات کسی غیر مسلم حکومت سے قائم کئے ہوں، وہ صرف دو حکومتوں کے تعلقات ہی نہیں ہیں بلکہ دو قوموں کے تعلقات بھی ہیں، اور ان کی اخلاقی ذمّہ داریوں میں مسلمان حکومت کے ساتھ مسلمان قوم اور اس کے افراد بھی شریک ہیں۔

اسلامی شریعت اس بات کو قطعاً جائز نہیں رکھتی کہ مسلم حکومت جو معاملات کسی ملک یا قوم سے طے کرے ان کی اخلاقی ذمہ داریوں سے مسلمان قوم یا اس کے افراد سبکدوش رہیں۔ البتہ حکومت دارالاسلام کے معاہدات کی پابندی صرف ان مسلمانوں پر ہی عائد ہوگی جو اس حکومت کے دائرۂ عمل میں رہتے ہوں۔ اس دائرے سے باہر دنیا کے باقی مسلمان کسی طرح بھی ان ذمہ داریوں میں شریک نہ ہوں گے۔

(تفہیم القرآن ج۲، ص۱۶۲)

دارالکفر کا کوئی مسلمان جو بدستور دارالکفر ہی کی رعایا بنا رہے، دارالاسلام میں آکر مسلمانوں کے ساتھ ان کے حقوقِ شہریت میں حصہ دار نہیں ہوسکتا، نہ یہ جائز ہے کہ دارالاسلام کی حکومت میں اسے کوئی ذمّہ داری کا عہدہ دیا جائے۔ یہ حقوق اور یہ مناصب اسے صرف اسی صورت میں مل سکتے ہیں جب کہ وہ ہجرت کر کے آجائے۔

(رسائل و مسائل ج۲، ص ۱۶۶)

مستأمن

دارالاسلام کی رعایا میں سے جو شخص عارضی طور پر دارالکفر یا دارالحرب میں امان لے کر جائے اس کو اسلامی اصطلاح میں مستأمن کہتے ہیں۔

(سود، ص۴۵۴)

مستأمن کے لئے پہلی شرط دارالاسلام کی رعایا ہونا ہے۔ اور دوسری شرط یہ ہے کہ دارالحرب میں اس کا قیام قلیل مدّت کے لئے ہو۔ حنفی قانون میں حربی مستأمن کے لئے دار الاسلام کے اندر رہنے کی زیادہ سے زیادہ مدّت ایک سال یا اس سے کچھ زیادہ رکھی گئی ہے۔ اس کے بعد وہ قانون تبدیل جنسیت کی رُو سے اس کو ذمّی بنا لیتا ہے۔

اسی پر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مسلمان مستأمن کے لئے بھی دار الحرب میں قیام

کرنے کی مدّت سال دو سال سے زیادہ نہیں ہوسکتی ۔ اسلامی شریعت جومسلمانوں کو دار الاسلام میں سمیٹنے اور کافروں کو ذمّی بنانے کے لئے سب سے زیادہ حریص ہے کبھی اس کی اجازت نہیں دیتی کہ کوئی شخص دارالحرب کو اپنا وطن بنا لے

(سود،ص۴۶۸)

مسلمان مستأمن کے لئے فرض ہے کہ جس غیر اسلامی حکومت میں وہ امن کی ضمانت لے کر داخل ہوا ہے وہاں کے مروّجہ قوانین کی سختی سے پابندی کرے ۔کسی کے مال وجان ،عزت و آبرو پر حملہ کر کے قانون وقت کو توڑنا غدر ہے ، اور غدر قرآناً، حدیثاً و اجماعاً حرام ہے ۔

(سود،ص۳۳۵)

جب کسی حکومت سے کوئی مسلمان معاہدہ کرنے کے بعد اس کی سرزمین میں داخل ہوتو اس حکومت نے دوسروں کی جان و مال ،عزت وآبرو کی حفاظت کے لئے جو قوانین نافذ کئے ہوں ان کی خلاف ورزی کرنا اس کے لئے قطعاً ناجائز ہے ۔

(سود،ص۳۲۵)

مسلمان کا فرض ہے کہ غیر مسلم علاقے میں اس وقت تک کسی کو کوئی نقصان یا گزند نہ پہنچائے جب تک وہ امان سے مستفیض ہو۔ اسے سود یا شراب ، یا لحم خنزیر کی فروخت کے متعلق اپنی شریعت پر عمل کرنا چاہئے ، اگر چہ غیر مسلم علاقے میں ان چیزوں کی خریدوفروخت ممنوع نہ ہو۔

اسلامی قانون بہر حال مسلمانوں پر حاوی ہے ،خواہ وہ کسی علاقے میں رہتے ہوں اگر مسلمان امان کی مدت پوری کر کے دار الاسلام میں واپس آجائے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ جو وعدے کر کے آیا ہے یا جو تجارتی معاہدے اس نے کئے ہیں اب انہیں بہر حال پورا کرے ۔مثلاً اگر اس نے کچھ قرض لیا ہے یا کوئی مال چرایا ہے ،تو دار الحرب کو چھوڑنے

کے بعد اسے واپس کرنا ضروری ہے۔ البتہ وہاں قیام کے دوران مسلمان کو کوئی ایسی بات نہ کرنی چاہئے جس سے دار الاسلام کے خلاف تقویت پہنچے۔ مثلاً اسے کوئی خبر نہیں دینی چاہئے، ہتھیار بنانے میں امداد سے احتراز کرنا چاہئے، اور ایسا جنگی سامان نہ دینا چاہئے جو دارالاسلام کے خلاف استعمال ہو سکے۔

(اسلام اور قانون جنگ و صلح، ص۱۶۷)

غیر مستأمن

اگر مسلمان امان کے بغیر دار الحرب میں داخل ہو جائے تو اس کے لئے ضروری نہیں کہ ان تمام قواعد وضوابط پر عمل کرے جن پر امان کے ماتحت عمل ضروری ہے۔ اسلامی نظریہ یہ ہے کہ غیر مسلم علاقے میں مسلمان کا امان کے بغیر جانا ایسا ہی ہے جیسے وہ برسر جنگ علاقے میں چلا جائے۔ لہٰذا غیر مسلم علاقے میں کسی قانون کا ماننا اس کے لئے ضروری نہیں۔ اگر چہ دوران قیام میں یہ امید نہیں رکھی جا سکتی کہ وہ معاندانہ حرکات میں مشغول ہو گا۔ اگر کوئی مسلمان امام کی اجازت سے دارالحرب میں داخل ہوتا ہے تو اسے جائداد لوٹنے یا قیدی پکڑنے کا ویسا ہی حق حاصل ہے جیسا کہ مجاہدین کو دوران جنگ میں حق حاصل ہوتا ہے۔

مسلمان کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ جن اعمال کو شریعت میں ممنوع قرار دیا گیا ہے، ان سے محترز رہے۔ مثلاً اگر کوئی مسلمان زنا کا مرتکب ہوگا، یا سور کا گوشت کھائے گا، یا شراب پیئے گا، یا کسی مسلمان کے حقوق پر دست درازی کرے گا تو دار الاسلام میں واپسی پر سزا کا مستوجب ہوگا۔ صرف حنفی فقہاء قانونی حدود میں ایک حد تک نرمی برتتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ مسلمان غیر مسلم علاقے میں ہو تو اسلامی قانون ان پر جاری نہیں ہوتا۔

(اسلام اور قانون جنگ و صلح، ص۱۶۸)

دار الاسلام اور امورِ داخلہ

دارالاسلام اور امورِ داخلہ

خلیفہ

اصولی طور پر تو دارالاسلام کی حدیں چاہے کتنی ہی وسیع کیوں نہ ہوجائیں سارے مسلمانوں کا امام اور خلیفہ ایک ہی ہونا چاہیئے ، اور مختلف خطّوں میں الگ الگ حکومتیں اور خلافتیں قائم کر لینا صحیح نہیں ہے ۔علامہ ماوردی لکھتے ہیں :

لا یجوز ان یکون للامۃ اماما ن فی وقت واحد۔

یہ بات جائزنہیں ہے کہ ایک ہی وقت میں امت کے دوخلیفہ ہوں ۔

(الاحکام السلطانیہ ،ص۹)

امام نوویؒ لکھتے ہیں :

اتفق العلماء علیٰ انه لا یجوز ان یعقد لخلیفتین فی عصر واحد ، سواء اتسعت دار الاسلام ام لا۔

علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ دارالاسلام کی حدیں چاہے وسیع ہوں یا غیر وسیع ایک ہی زمانہ میں دو دو آدمیوں کی خلافت کا قیام جائزنہیں ۔

(شرح مسلم ،ج۲،ص۱۲٦)

شریعت نے اس اصول کو بڑی اہمیت دے رکھی ہے ۔اس کے نزدیک وہ شخص گردن زدنی ہےجس کے ہاتھ پر ایک خلیفہ کے ہوتے ہوئے خلافت کی متوازی بیعت کر لی گئی ہو۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا صریح ارشاد ہے کہ:

اذا بویع لخلیفتین فاقتلوا الاخر منهما۔

اگر خلافت کی بیعت دو آدمیوں کے ہاتھ پر کر لی جائے تو بعد والے شخص کو قتل کر دو۔

(مسلم، ج۲، ص۱۲۸)

اسلام میں اپنے پیرووں کو خلافت کا نظام قائم کرنے کی ہدایت صرف اس لئے دی ہے تا کہ وہ خود حکمران بن کر رہے، انسانی زندگی پر اس کے قوانین کا نفاذ ہو، اس کے مشن کو گوشے گوشے تک پہنچایا جائے، اس کی اور اس کی پیرو ملت کی دشمنوں سے حفاظت ہو، اور اس کے غلبہ و اقتدار کی حدیں پھیلتی رہیں۔ ایسی حالت میں اگر پوری امت مسلمہ ایک گروہ ایک قوم، اور ایک سیاسی وحدت ہونے کے بجائے متعدد سیاسی وحدتوں میں بٹی رہے اور اس طرح پورا دار الاسلام عملاً مختلف ریاستوں اور حکومتوں میں تقسیم ہو جائے تو یہ اسلام کے قوی ہونے کی نہیں بلکہ کمزور ہونے کی علامت ہوگی۔ اس لئے اسلام میں ضروری قرار دیا ہے کہ ایک ہی مشن کی علمبردار امت کو سیاسی طور پر بھی ایک ہی امت اور ایک ہی قوم رہنا چاہئے۔

(اسلام اور اجتماعیات، ص۱۴۹)

بعض فقہاء مثلاً باقلانی، ابن رُشد، اور ابن خلدون کہتے ہیں کہ اگر دار الاسلام کی حدود بہت وسیع ہو جائیں، یا بعض خطّوں کے درمیان سمندر حائل ہو تو دو یا زیادہ امام بھی مقرر کئے جا سکتے ہیں، اور ہر ایک کو اپنے اپنے دائرے میں ایسے طریق پر قانون کے نفاذ کا بندوبست کرنا چاہئے کہ اسلام کے اصل نصب العین کی تکمیل کو تقویت پہنچے۔

(اسلام اور قانون جنگ و صلح، ص۱۵۴)

ابتدائی زمانہ میں جب تمام اسلامی مقبوضات ایک ہی حکومت کے ماتحت تھے تو دار الاسلام خلیفۂ اسلام کے حدودِ سلطنت کا ہم معنیٰ تھا، مگر اسلام کے دستوری قانون کی بنیاد جن اصولوں پر رکھی گئی ہے، وہ ایسے ہیں کہ جب دار الاسلام ٹکڑے ٹکڑے ہو کر مختلف مسلم ریاستوں میں تقسیم ہو گیا تو خود بخود دولت مشترکہ کا تصور پیدا ہو گیا۔

ہر اسلامی مقبوضہ خواہ وہ دنیا کے کسی گوشے میں ہو، اور کسی حکمران کے ماتحت ہو

بہرحال دار الاسلام کا ایک جُز ہے ۔اور ہر مسلمان خواہ وہ کہیں پیدا ہو دار الاسلام میں داخل ہوتے ہی خود بخود اس کی رعیت بن جاتا ہے، اور تمام حقوق شہریت اس کو حاصل ہو جاتے ہیں، بشرطیکہ اس نے کسی دار الکفر کے ساتھ رعایا ہونے کا تعلق نہ جوڑ رکھا ہو ۔ موجودہ اسلامی حکومتیں خواہ اس پر عمل کریں یا نہ کریں ،لیکن اسلامی قانون کی رُو سے کوئی مسلمان کسی اسلامی حکومت میں غیر ملکی نہیں ہے ۔ایک افغان کے حقوق اور واجبات ،ترکی اور ایران میں بھی وہی ہونے چاہئیں جو خود افغانستان میں ہیں ۔اور ایک مسلمان کے لئے یہ ہرگز ضروری نہ ہونا چاہئے کہ اگر وہ ایک اسلامی حکومت کے حدود سے نکل کر دوسری اسلامی حکومت کے حدود میں آباد ہو تو وہاں کی رعیت بننے کے لئے کوئی مصنوعی طریقہ اختیار کرے ۔ ہر مسلمان دار الاسلام کا پیدائیشی شہری ہے ۔

(سود.ص۴۵۱)

دار الاسلام کے شہری

دار الاسلام کے باشندے دو قسم کے ہوتے ہیں ایک مسلمان یعنی وہ تمام لوگ جو دین اسلام پر ایمان رکھتے ہوں ، دوسرے ذمّی ، یعنی تمام غیر مسلم جو مستقلاً دار الاسلام میں قیام پزیر رہتے ہوں دار الاسلام کے تمام باشندوں کے جان و مال محفوظ ہیں خواہ وہ باشندے مسلمان ہوں یا ذمّی ۔مسلمانوں کے اسلام کی بنا پر اور ذمیوں کے عقدِامان کی وجہ سے ۔

(اسلام کا فوجداری قانون .ج۱.ص۳۶۹)

اسلامی قانون جن افعال کو حرام قرار دیتا ہے ان سے دار الاسلام کے مسلمان دیناً و قضاءً دونوں حیثیتوں سے روکے جائیں گے ۔مگر جو مسلمان دار الاسلام میں نہیں ہیں ان کا معاملہ ان کے اور خدا کے درمیان ہے ۔دین کا احترام دل میں ہو تو باز رہے، اور نہ ہو تو جو چاہے کرے اس لئے کہ اسلام کو ان پر نفاذ احکام کا اقتدار حاصل نہیں ہے ۔(سود ص ۴۵۲)

گویا دار الاسلام میں شہریت کی بنیاد اسلام سے وابستگی اور دار الاسلام میں مستقل اقامت اختیار کرنا ہے۔ اس اساس کی تبدیلی سے شہریت بدل سکتی ہے۔ چنانچہ ارتداد سے مسلمان کی جنسیّت تبدیل ہو جاتی ہے، اور وہ حربی بن جاتا ہے۔

(اسلام کا فوجداری قانون.ج۱.ص۳۹۸)

ذمّی

ذمّی شہریوں سے مراد وہ تمام غیر مسلم ہیں جو اسلامی ریاست کے حدود میں رہ کر اس کی اطاعت ووفاداری کا اقرار کریں، قطع نظر اس سے کہ وہ دار الاسلام میں پیدا ہوئے ہوں، یا باہر سے آ کر ذمّی بننے کی درخواست کریں۔

(اسلامی ریاست.ص۲۳۰)

مسلمانوں کے ذمّے میں داخل ہونے کی شرط یہ ہے کہ دار الاسلام کی جانب ہجرت کی جائے۔ اس لئے محارب کو اس وقت تک ذمّی تصوّر نہیں کیا جائے گا جب تک وہ اپنے ملک میں موجود ہے، الاّ یہ کہ اس کا سارا ملک مسلمانوں کے ذمّہ میں داخل ہو جائے، اور اس کے تمام رہنے والے احکام اسلامی کی اتباع قبول کر لیں، کیونکہ اس صورت میں پورا ملک ہی دار الاسلام بن جائے گا۔

(اسلام کا فوجداری قانون.ج.۱.ص۳۹۹)

بلاد اہل الحرب پر اگر لشکر اسلام بزور شمشیر قبضہ کرے تو ان پر جزیہ عائد کیا جائے گا، وہ اہل الذّمّہ یا ذمّی کی حیثیت سے دار الاسلام کے شہری قرار پائیں گے۔ ان کے حقوق اور فرائض میں اور عامۃ المسلمین کے حقوق وفرائض میں بجز اس کے کوئی فرق نہ ہوگا کہ ذمّی شہریوں کے جان و مال کی حفاظت اسلامی ریاست کا فرض ہوگا، لیکن وہ اسلامی ریاست کے دفاع کے فریضے سے مستثنیٰ ہوں گے، اور اس کے بدلے میں ان کا فرض ہوگا کہ وہ جزیہ کے

ذریعے اسلامی ریاست کی مالی معاونت کریں۔لیکن بنیادی شہری حقوق (آزادئی مذہب ، آزادئی معاش، آزادئی رائے ، اورحقِ انصاف وغیرہ) میں ان کے ساتھ کسی قسم کا امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا۔

(اردو دائرہ معارف الاسلامیہ،ج۹،ص۱۱۰)

اسلامی نقطۂ نظر سے جہاد کا فریضہ صرف مسلمانوں پر عائد ہوتا ہے ۔اسلامی ریاست کی غیرمسلم رعایا کے لئے جہاد میں حصہ لینا ضروری نہیں ہے ۔لیکن اگر وہ اپنی مرضی سے مسلمانوں کے ساتھ مل کر دار الاسلام کے دفاع میں حصّہ لینا چاہیں تو وہ ایسا کر سکتے ہیں ۔ ایسی صورت میں ان پر سے جزیہ ساقط کر دیا جائے گا۔کیونکہ جزیہ دراصل ان کی حفاظت کے عوض وصول کیا جاتا ہے ۔اصولی طور پر وہ فوجی خدمات سے مستثنٰی ہوتے ہیں ، اس لئے جب وہ عملاً اسلامی ریاست کے دفاع میں شرکت پرآمادہ ہوجائیں تو ان پر جزیہ ساقط ہونا چاہئے

(اردو دائرہ معارف الاسلامیہ،ج۹،ص۱۱۰)

صرف دوصورتیں ایسی ہیں جن میں ایک ذمّی خارج الذمّہ ہو جاتا ہے،ایک یہ کہ وہ دار الاسلام کو چھوڑ کر دشمنوں سے جا ملے ، دوسری یہ کہ حکومت اسلامی کے خلاف صریح بغاوت کر کے فتنہ اورفساد بر پا کرے ۔

(اسلامی ریاست میں ذمیوں کے حقوق،ص۱۸)

حربی مستأمن

وہ کافر حربی جو دار الحرب سے دار الاسلام میں امان لے کر ایک مدت معیّنہ کے واسطے داخل ہوا اسے مستأمن کہتے ہیں ۔ (فتاویٰ عالمگیریہ،اردو،ج۹،ص۱۶۴)

شریعت اسلامیہ میں امان کی دو قسمیں ہیں ، دائمی امان اور وقتی امان ۔

دائمی امان میں کوئی انتہائی مدّت متعین نہیں ہوتی ہے ، اورصرف معاہدہ اہل ذمّہ

سے ہوتا ہے،اور اس سے صرف وہ ذمّی مستفید ہو سکتے ہیں جو سرزمین اسلام میں مستقلاً قیام پذیر ہوں ۔وقتی امان کسی معین مدت تک محدود ہوتی ہے، جیسے مھاونت (عارضی صلح) اور جیسے کچھ وقت کے لئے دارالاسلام میں داخلے کی اجازت ۔

(اسلام کا فوجداری قانون ،ج۱ص،۳۷۰)

مستأمن کافروں کا معاملہ بھی ذمیوں سے مختلف نہیں ہے کیونکہ ان پر بھی اسلامی حکومت کے احکام نافذ ہوتے ہیں،اور دارالاسلام میں ہونے کی وجہ سے ان کو عصمت جان و مال حاصل ہوتی ہے ۔ (سود،ص،۴۲۵)

باہر سے آنے والے غیر مسلم جو مستأمن کی حیثیت سے دار الاسلام میں داخل ہوں ،تجارت ،صنعت و حرفت ، سیاست اور حصول تعلیم اور دوسرے تمام تمدّنی مقاصد کے لئے تو ضرور آسکتے ہیں،لیکن اس غرض کے لئے ہرگز نہیں آسکتے کہ اللہ کے کلمے کے مقابلے میں کوئی دوسرا کلمہ بلند کریں ۔ اللہ نے کفار کے خلاف جو مدد اپنے پیغمبر کو اور اس کے بعد مسلمانوں کو دی ، یا آئندہ دے گا ، اور جس کے نتیجے میں دارالاسلام پہلے قائم ہوا ، یا آئندہ کبھی قائم ہوگا ، اس کی غرض صرف یہی تھی کہ کفر کا بول نیچا ہو، اور اللہ کا بول بالا ہو کر رہے ۔

(مرتد کی سزا اسلامی قانون میں،ص۳۸)

مستأمن کے لئے واجب ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی عقائد اور اعمال کا احترام کرے، اور کوئی ایسی بات کہنے یا کرنے سے محترز رہے جس سے اسلام کے احترام کا فقدان ثابت ہو ۔ضروری ہے کہ اس کی کوئی سرگرمی مسلمانوں کے مفاد کو نقصان نہ پہنچائے، اور نہ ان کے لئے خطرہ پیدا کرے ۔ اگر وہ حقیقت میں جاسوس تھا لیکن مستامن کی حیثیت میں دارالاسلام چلا آیا تو اسے موت کی سزا بھی دی جاسکتی ہے ۔

(اسلام کا قانون جنگ و صلح،ص ۱۶۳)

اگر مستأمن بعض قاعدوں کے خلاف ورزی کرے ، یا اس سے کوئی جرم سرزد ہو

جائے ،تو امان بحال رہے گی ،لیکن اسے سزا دی جا سکے گی ۔

(اسلام کا قانون جنگ و صلح. ص ۱۶۳)

مستأمن کوعموماً تین ماہ سے زائد دارالاسلام میں قیام کی اجازت نہیں ،اگر وہ اس سے زائدعرصہ قیام کرنا چاہےتو ذمّی کی حیثیت سے رہے گا ،اور جزیہ ادا کرے گا۔

(اردو دائرہ معارف اسلامیہ .ص.۱۱۰.ج۹)

حربی

وہ حربی جن کا دارالاسلام سے کوئی معاہدہ نہ ہو، دارالاسلام میں داخل نہیں ہو سکتے اور اگر کوئی حربی بغیر امان حاصل کئے دارالاسلام میں آ جائےتو اس کا جان و مال مباح ہے، اسےقتل کر کے اس کا مال سلب کیا جا سکتا ہے ،اور اس کو قید کرنا ،اور معاف کر دینا بھی جائز ہے۔

(اسلام کا فوجداری قانون.ج.۱.ص۳۷۱)

اگر کوئی حربی بلا امان دارالاسلام میں داخل ہو جائے ، یا اسے امان نہ مل سکی ہو،تو یا اسے موت کی سزا دی جا سکے گی ، یا اسے اسلام قبول کرنا پڑے گا ۔امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اسے چار مہینے کی مہلت دی جائے ،اس کے اختتام پر یا تو اسے حفاظت سے سرحد پر پہنچا دیا جائے ، یا وہ جزیہ ادا کر کے ذمّی بن جائے ، یا اسلام اختیار کرے ۔دوسرے فقہاء کی رائے ہے کہ اسے باہر نکال دیا جائے ،لیکن دارالحرب پہنچنے تک حفاظت کا بندوبست کر دیا جائے ۔

(اسلام اور قانون جنگ و صلح. ص ۱۶۳)

حربی غلطی سے بھی دارالاسلام میں داخل ہوسکتا ہے ،یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ کسی جہاز میں سوار تھا ، جہاز تباہ ہوگیا ،اور وہ بیچارگی کی حالت میں کنارے آ لگا ۔اس طرح امان کے بغیر اسلامی علاقے میں پہنچ گیا ۔اکثر فقہاء کی رائے یہ ہے کہ امام ایسے حربی کو آزاد بھی کر سکتا ہے،قتل بھی کرسکتا ہے،اور فدیہ لے کر رہا بھی کرسکتا ہے ۔ (ایضاً)

دار الاسلام

کی معاشی

پالیسی

دارالاسلام کی معاشی پالیسی

معاشی پالیسی

ایک اسلامی ریاست کے سامنے صرف یہی مقصد نہ ہوگا کہ وہ تہذیبی طور پر ممتاز اور اجنبی تہذیبوں کے اثرات سے محفوظ رہے، بلکہ اسے تہذیب اور نظریات کے میدان میں ایک فعال داعیانہ کردار اختیار کرنا ہے۔ داعی کی حیثیت دینے والے کی ہونی چاہیئے، نہ کہ دست سوال دراز کرنے والے کی۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب دار الاسلام صنعتی ترقی کے میدان میں اگر دوسرے ملکوں سے آگے نہیں تو ان سے بہت پیچھے بھی نہ ہو۔

(اسلام کا نظریہ ملکیت، ج ۲، ص ۱۲۵)

آج جب کہ تہذیبی کشمکش اور نظریاتی جنگ میں بیرونی امداد اور بین الاقوامی معاشی تعاون کو ایک اہم مقام حاصل ہو چکا ہے۔ ایک اسلامی ریاست کے پاس اتنے وسائل ہونے چاہئیں کہ وہ اپنی دعوت کے لئے راہ ہموار کرنے کی خاطر ان ذرائع کو استعمال کر سکے یہ اسی وقت ممکن ہے جب دارالاسلام معاشی طور پر ترقی یافتہ ہو۔

(اسلام کا نظریہ ملکیت، ج ۲، ص ۱۲۵)

فقراء کی اعانت اور فقر و احتیاج کو دار الاسلام سے نکال باہر کرنے، دفاعی ضروریات اور دارالاسلام کی معاشی ترقی کے لئے زکوٰۃ کے علاوہ مزید محاصل بھی عائد کئے جا سکتے ہیں۔

کفالت عامہ

اسلامی ریاست چونکہ ایک فلاحی مملکت قرار دی گئی ہے اس لئے اس کا معاشی نظام رفاہ عامہ کے اجتماعی کاموں کے علاوہ لوگوں کی کفالت عامہ کا ضامن بھی ہے۔ کفالت عامہ

سے مراد یہ ہے کہ دار الاسلام کے حدود کے اندر بسنے والے ہر انسان کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کا اہتمام کیا جائے، یہ اہتمام اس درجہ تک ہونا چاہیئے کہ کوئی فرد ان ضروریات سے محروم نہ رہے، ان بنیادی ضروریات میں غذا، لباس، مکان اور علاج لازماً شامل ہے۔ ہر وہ ضرورت بنیادی ضرورت ہے جس پر کسی انسان کی زندگی کی بقاء کا انحصار ہو، جن چار ضرورتوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان کی نوعیت یہ ہے کہ ان کی عدم تکمیل آدمی کی جان کو خطرہ میں ڈال دیتی ہے۔ کم از کم ان ضرورتوں کی تکمیل اس اصول کا لازمی تقاضہ ہے۔

(اسلام کا نظریۂ ملکیت، ج۲، ص۹۲)

اسلامی ریاست اس بات کی ذمہ دار ہے کہ کوئی فرد ان وسائل حیات سے محروم نہ رہے، جو ضروریات زندگی کی تکمیل کے لئے درکار ہیں۔ ریاست کو ایسا نظم قائم کرنا پڑے گا کہ محروم افراد اپنی محرومی کا ثبوت فراہم کر کے بآسانی اور بلا تاخیر اجتماعی خزانے سے بقدر ضرورت مال حاصل کر سکیں، اور دار الاسلام کا کوئی باشندہ بھوکا، ننگا، بے ٹھیکانہ، اور مرض کی حالت میں بے علاج نہ رہے۔

(اسلام کا نظریۂ ملکیت، ج۲، ص۹۳)

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ جس کا کوئی سرپرست نہیں اس کا سرپرست اللہ اور اس کا رسول ہے۔ اس کے صاف معنیٰ یہ ہیں کہ جس فرد کا مملکت میں کوئی کفیل نہ ہو، اس کی کفالت کی ذمہ داری اسلامی حکومت پر عائد ہوتی ہے، جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے عائد کردہ اجتماعی ذمّہ داریوں سے عہدہ برآں ہونے کے عوض وجود میں آتی ہے، اور اس معاملے میں مسلم اور غیر مسلم رعایا کی کوئی تفریق نہیں۔

(ماہنامہ ترجمان قرآن، نومبر ۱۹۷۰ء، ص۳۷)

بیت المال میں ذمیوں کا کچھ حق نہیں، لیکن اگر حاکم یہ دیکھے کہ کوئی اہل ذمّہ بھوک کے مارے ہلاک ہو رہا ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اس ذمّی کو بیت المال سے دے، اس

لئے کہ دار الاسلام کے رہنے والے باشندوں میں سے ہے، اور اس کے زندہ رکھنے کی کوشش حاکم کے ذمّہ ہے۔

(فتاوی عالمگیری اردو ص۱۰۸۱)

حضرت خالد بن ولیدؓ نے اہل حیرہ سے جن شرائط پر صلح کی تھی ان میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ ان میں سے ایسا بوڑھا آدمی جو کام سے معذور ہو جائے، یا اس پر کوئی مرض یا مصیبت آن پڑے، یا جو پہلے مالدار رہا ہو اور پھر ایسا غریب ہو جائے کہ اس کے ہم قریب اسے خیرات دینے لگیں تو اس کے اور اس کے اہل وعیال کے مصارف بیت المال سے پورے کئے جائیں گے۔

(اسلام کا نظام محاصل ص۴۲۳)

بیت المال

بیت المال میں جو چیزیں رکھی جائیں گی اس کی چار قسمیں ہیں۔

اوّل: سائمہ جانوروں کی زکوٰۃ اور عشر اور وہ رقم جو عاشر، ان مسلمان تاجروں سے وصول کرتا ہے جو اس پر گزرتے ہیں۔ ان رقوم کے محل وہ مصارف ہیں جو زکوٰۃ کے مصارف ہیں فقرا و مساکین وغیرہ۔ دوم: رکاز، معادن، اور غنیمت کا خمس، ان کے مصارف یتامیٰ، مساکین اور مسافر ہیں۔ سوم: خراج، جزیہ اور وہ رقم جو عاشر، متامن اور ذمّی تاجروں سے لیتا ہے ان کے مصارف مقاتلین ومجاہدین کے عطایا، سرحدوں کی درستگی، قلعوں کی تعمیر، دار الاسلام میں گزرگاہ پر محافظین کی چوکیوں کی تعمیر، تاکہ چور و ڈاکوؤں سے امن ہو جائے۔ اور چھوٹے بڑے پلوں کی اصلاح، بڑی بڑی پبلک نہروں کی کھدائی، جس پر کسی کی خصوصی ملکیت نہ ہو، اور رباطوں اور مسجدوں کی تعمیر اور بند باندھنا، اور جہاں کہیں بند کے ٹوٹنے کا خوف ہو پشتہ باندھنا، والی اور والی کے ماتحت کام کرنے والے اور قاضی اور

مفتی ،محتسب،معلم ،اور متعلم کے وظائف ، وہ تمام لوگ جو مذہبی خدمات سرانجام دیتے ہوں، اور مسلمانوں کی صلاح وفلاح کے لئے کارکن کی حیثیت رکھتے ہوں۔

چہارم: لقطے اور لاوارث میت کی متروکہ چیزیں یا ایسے میت کا متروکہ جنہوں نے شوہر یا بیوی کے کسی کو نہ چھوڑا ہو۔ اس قسم کے مال میں مریضوں کی دواؤں، اور محتاج اور فقیر کے ضروری اخراجات، لاوارث مردوں کا کفن، لاوارث بچوں پر دیت، مجبور اور اپاہج لوگوں کی پرورش جن کے نفقہ کا وجوب کسی پر نہ ہو، اور اس طرح کے دوسرے لوگ۔

(کتاب العشر و زکوٰۃ ،ص۱۰۲)

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خلفائے راشدین کے دور میں بیت المال کی ساری آمدنی، مستحقین کی امداد اور مجاہدین کے وظائف کے طور پر تقسیم کر دی جاتی تھی، اور عام پالیسی یہ تھی کہ بیت المال میں فاضل مال نہ رکھا جائے۔ شریعت نے بیت المال میں جمع ہونے والی آمدنی کے مصارف متعین کر دئے ہیں اور اسلامی حکومت اس سلسلہ میں وصول کرنے اور تقسیم کر دینے والے درمیانی رابطے کا کام کرتی ہے۔ خلفائے راشدین بیت المال کے بارے میں اتنی احتیاط کرتے تھے کہ ان میں سے جو لوگ صاحب مال تھے، انہوں نے اپنا سارا وقت امور ریاست کی نذر کر دینے کے بعد بھی بیت المال سے کوئی مشاہرہ لینا پسند نہیں کیا۔

حضرت ابو بکرؓ نے اپنی وفات کے وقت یہ وصیت فرمائی کہ انہوں نے اپنے منصب خلافت کے دوران بیت المال سے مشاہرہ کے طور پر جو کچھ لیا ہے اس کا حساب لگا کر اتنی رقم ان کے ترکہ میں سے بیت المال میں داخل کر دی جائے۔

(اسلام کا نظریۂ ملکیت ،ج۲،ص۸۹)

زکوٰۃ

زکوٰۃ ارکان اسلام میں سے ایک بنیادی رکن ہے۔ ایک پہلو کے اعتبار سے تو یہ

عبادت ہے، اور دوسرے پہلو کے اعتبار سے اسلامی ریاست کی آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ ہے زکوٰۃ ہر عاقل و بالغ مسلمان پر واجب ہے۔ بشرطیکہ وہ صاحب نصاب ہو۔

مسلمانوں پر زکوٰۃ اور عشر کے مسئلہ میں دار الحرب اور دار الاسلام کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں پڑتا، وہ ہر جگہ جہاں کہیں بھی ہوں نماز، روزہ، حج وغیرہ کی طرح زکوٰۃ کے بھی مکلف ہیں۔ نماز اور زکوٰۃ میں جس طرح دارالاسلام میں کوئی فرق نہیں ہے، اسی طرح نماز، و زکوٰۃ میں دارالحرب میں بھی کوئی فرق نہیں ہے۔ تاہم دارالاسلام میں مسلمانوں کو اپنی زکوٰۃ و عشر وغیرہ امام کو یا اس کی طرف سے مقرر کردہ عاملین کو ادا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اور امام کو مسلمانوں سے زکوٰۃ وصول کرنے کا حق ہوتا ہے، لیکن مسلمانوں کا امام جس طرح دارالحرب میں مسلمانوں پر زنا، چوری، ڈکیتی وغیرہ پر حد جاری نہیں کرسکتا ہے، مسلمانانِ دارالحرب سے زکوٰۃ بھی جبراً وصول نہیں کرسکتا ہے۔ لیکن دارالحرب کے مسلمانوں کو زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم دیا جائے گا۔ اگر وہ زکوٰۃ نہیں ادا کریں گے تو گناہ گار ہوں گے، جیسے نماز اور روزہ کے ترک پر گناہ گار ہوں گے۔

(کتاب العشر وزکوٰۃ ص۱۲۰)

اگر دار الحرب میں کوئی شخص مسلمان ہو جائے، اور کئی سال وہیں رہے اور پھر دارالاسلام میں آجائے تو حاکم کو یہ اختیار نہیں ہے کہ اس سے اس عرصہ کی زکوٰۃ میں سے کچھ لے، اس لئے کہ وہ اس کی ولایت میں نہ تھا۔

(فتاویٰ عالمگیری اردو ص۱۵۹)

کافر دارالحرب میں مسلمان ہوا اور وہیں چند برس تک اقامت کی، پھر دار الاسلام میں آیا، اگر اس کو معلوم تھا کہ مالدار مسلمان پر زکوٰۃ واجب ہے تو اس زمانہ کی زکوٰۃ واجب ہے ورنہ نہیں، اور اگر دار الاسلام میں مسلمان ہوا اور چند سال کی زکوٰۃ نہیں دی تو ان کی زکوٰۃ

واجب ہے اگر چہ کہتا ہو کہ مجھے فرضیت زکوٰۃ کا علم نہیں، کہ دار الاسلام میں جہل عذر نہیں۔

(بہار شریعت ج.۵.ص۱۰)

ذمّی کافر کو نہ زکوٰۃ دے سکتے ہیں، نہ کوئی صدقہ واجب جیسے نذر و کفّارہ، وصدقۂ فطر، اور حربی کو کسی قسم کا صدقہ دینا جائز نہیں، نہ واجب، نہ نفل۔ اگر چہ وہ دار الاسلام میں بادشاہ اسلام سے امان لے کر آیا ہو۔

(بہار شریعت.ج۵.ص۶۳)

دار الحرب سے دار الاسلام کو زکوٰۃ بھیجنا مکروہ نہیں ہے۔ دار الاسلام کے غریب مسلمان دار الحرب کے غریب مسلمانوں سے افضل ہیں، البتہ دار الحرب میں مسلمان قیدی مستثنیٰ ہیں۔ (فتاویٰ عالمگیری اردو،۱۰۷۱)

عشر

عشر بھی دراصل زکوٰۃ ہی ہے جو مسلمانوں سے ان کی زمین کی پیداوار پر وصول کی جاتی ہے۔ زکوٰۃ کی طرح عشر بھی مسلمانوں پر ہر حال میں فرض ہے خواہ وہ دار الاسلام میں ہوں یا دار الحرب میں۔ مسلمانان دار الحرب کے وہ کل اموال جو اسلام لانے کے وقت ان کے قبضہ میں تھے شرعاً وہ سب کے سب ان کی ملک میں رہیں گے، اور وہ ان کے مالک ہوں گے، اور مسلمانان دار الحرب کی وہ کل زمینیں جو اس وقت ان کے پاس نہیں شرعاً وہ سب ان کی ملکیت میں رہیں گی اور وہ عشری ہوں گی۔

(کتاب العشر و زکوٰۃ.ص۱۲۲)

امام ابو یوسفؒ کتاب الخراج میں لکھتے ہیں:

فكل ارض اسلم اهلها عليها وهى من ارض العرب او ارض العجم فهى لهم ، وهى ارض عشر۔

ہر ایسی زمین کے اس کے مالک نے اسلام قبول کر لیا ہو چاہے وہ عرب کی زمین ہو یا عجم کی وہ زمین عشری ہوگی۔ (کتاب العشر والزکوٰۃ،ص ۱۲۲)

گویا تمام روئے زمین کے لئے چاہے وہ عرب ہو یا عجم یہی حکم ہے کہ جب وہاں کے باشندے مسلمان ہو جائیں گے تو وہ زمین جو ان کے قبضہ میں ہوگی وہ عشری ہوگی ،اور اس کی پیداوار پر انہیں عشر ادا کرنا ہوگا۔

جزیہ

اہل کتاب اور مشرکین اگر مغلوب و مقہور ہو کر اسلامی اقتدار کو تسلیم کر لیں اور سالانہ تھوڑا سا ٹیکس ادا کر کے اس شرط پر اسلامی حکومت کے زیر اقتدار آجائیں کہ حکومت ان کے جان و مال اور آبرو کی محافظ رہے تو ایسے ٹیکس کو جزیہ کہتے ہیں۔

(اسلام کا اقتصادی نظام ،ص ۱۱۸)

چونکہ ذمّی لوگ ایک طرف کفر پر مصر ہیں ،اور دوسری طرف وہ اپنی جان و مال کی حفاظت تو چاہتے ہیں لیکن مسلمانوں کے ساتھ مل کر دارالاسلام کے دفاع میں اور دارالحرب کے خلاف جہاد میں شریک ہونے کے لئے تیار نہیں ہوتے اس لئے ان کے سامنے ایک آسان متبادل صورت رکھی گئی ہے ،اور وہ یہ کہ شہری حقوق کے بدلے وہ مالی ذمّہ داری قبول کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک شہری کے طور پر جزیہ کی مناسب مقدار انہیں ادا کرنا پڑتی ہے۔اس میں ایک نفسیاتی نکتہ بھی ہے ،چونکہ دار الاسلام کے باشندے اس کی حفاظت اور دفاع کے لئے اپنی رغبت سے جان و مال کی قربانی دیتے ہیں، اور ایک غیر مسلم سے یہ توقع نہیں ہوتی کہ دار الاسلام سے اسے قلبی وابستگی ہوگی ، اور ظاہر ہے کہ قدرتاً اس کا اندرونی میلان دار الحرب ہی کی طرف ہوتا ہے اس لئے اس سے سچّی قربانی اور کامل امداد کی توقع نہیں رکھی جا سکتی۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج ۷،ص ۲۴۱)

جزیہ ادا کرنے کے بعد غیر مسلم دار الاسلام میں مستقل قیام کر سکتے ہیں ، اور ان سے قتال نہیں کیا جا سکتا ، اور ان کی حمایت کی جاتی ہے تا کہ وہ دار الاسلام میں امن اور حفاظت سے زندگی بسر کر سکیں ۔اس میں دیگر فائدوں کے علاوہ یہ بھی ایک فائدہ ہے کہ دار الاسلام میں اس طرح سکونت سے ان کے لئے ہدایت کا راستہ آسان ہو جاتا ہے ۔ وہ مسلمانوں کے درمیان رہ کر ان کے انصاف اور خوبیوں کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکالیں گے کہ وہ راہ ہدایت پر ہیں ،اس کے بعد اوّل تو وہ اسلام لے آئیں گے ۔اور اگر وہ مسلمان نہ ہوئے تو بھی ان کے اور مسلمانوں کے درمیان امن اور اتحاد کا رشتہ مستحکم رہے گا ، اور وہ دار الاسلام کے انصاف و مساوات کے نظام میں حائل نہ ہوں گے ۔

جزیہ اور جو چیز کہ دار الحرب والے امام کو ہدیہ دیں یہ سب چیزیں مسلمانوں کی مصلحتوں میں صرف کی جائیں گی ۔ اس سے سرحدیں بند کی جائیں گی، اور پُل بنائے جائیں گے ، اور اس میں سے مسلمانوں کے قاضیوں اور عمال اور عالموں کو اس قدر دیا جائے گا جو ان کو کافی ہو ۔ اور اس میں سے جہاد کرنے والوں اور ان کی اولاد کو روزینہ دیا جائے گا ۔حضرت خالدؓ نے اہل حیرہ سے جو صلح کا معاہدہ کیا تھا اس کی رو سے اگر کوئی بوڑھا ذمّی کام کرنے کے قابل نہ رہے ، یا غریب ہو جائے تو اس کا جزیہ معاف کر دیا جائے گا ، اور مسلمانوں کے بیت المال سے اس کی اور اس کے بال بچوں کی کفالت کی جائے گی ۔

(اسلام کا نظام محاصل ص۴۲۳)

درآمد و برآمد

دار الحرب سے جو تاجر تجارت کی غرض سے دار الاسلام آنا چاہیں انہیں اس کی اجازت ہے ۔مسلمان حکمرانوں نے تجارت کے لئے دارالاسلام کے دروازے غیر مسلموں پر کھول کر بڑی رواداری کا ثبوت دیا ۔عام طور پر غیر مسلم تاجروں کو چار ماہ کے لئے امان دی

جاتی تھی۔ اگر اس دوران میں ان کا کاروبار مکمل نہ ہوتا تو امان کی تجدید ہو جاتی ۔مستأمن کی حیثیت سے مقامات مقدسہ حجاز کے سوا دارالاسلام کے ہر حصّہ میں آ جا سکتے تھے۔

(اسلام اور قانون جنگ و صلح، ص۲۱۳)

مسلم فقہاء غیر مسلم تاجروں کو دار الاسلام میں تجارت کے لئے بڑی بے تکلّفی سے اجازت دیتے تھے، لیکن دار الحرب کے ساتھ تجارت کرنے والے مسلمانوں کے بارے میں ان کا رویہ حوصلہ افزا نہ تھا۔ مالکی اور ظاہری تو اس بات کے روا دار نہ تھے کہ مسلمان دار الحرب میں جائے، اور وہاں بتوں کی پوجا دیکھے، یا وہاں کے قانون کی پیروی قبول کرے۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ امام کو سرحدوں پر تمام مسافروں کی دیکھ بھال کا انتظام کرنا چاہئے اور مسلمان تاجروں کو دار الحرب میں جانے سے روک دینا لازم ہے۔ ابن حزم کے نزدیک صرف جہاد یا تبلیغ کی غرض سے مسلمانوں کو دار الحرب میں جانے کی اجازت ہے، لیکن اکثر فقہاء خصوصاً حنفی فقہاء تجارت کے لئے بھی اجازت دیتے ہیں۔

(اسلام اور قانون جنگ و صلح، ص۲۱۴)

عام اصول یہ تھا کہ دار الاسلام چونکہ دار الحرب سے اصولاً برسر پیکار تھا اس لئے دار الاسلام سے سامان جنگ دار الحرب میں لے جانے کی اجازت نہ تھی۔ تمام فقہاء سامان جنگ ممنوع البیع ہونے پر متفق ہیں۔ اگر بیرونی تاجر بعض ممنوع چیزیں خرید لے تو خرید جائز رہتی ہے، لیکن تاجر کے لئے لازم ہے کہ دار الاسلام چھوڑنے سے پیشتر وہ چیزیں دوبارہ دارالاسلام کے کسی تاجر کے ہاتھ فروخت کر دے۔ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ امام کو چاہئے کہ دار الاسلام کی سرحد پر جگہ جگہ حفاظتی مرکز بنا دے تا کہ بیرونی تاجروں کے مال و اسباب کی جانچ پڑتال ہوتی رہے، اور وہ کوئی ممنوع شے باہر نہ لے جا سکیں۔ بیرونی تاجروں کو یہ بھی اجازت نہیں کہ وہ حرام چیزیں دار الاسلام میں فروخت کریں مثلاً سور کا

گوشت،شراب وغیرہ۔

(اسلام اور قانون جنگ و صلح،ص۲۱۴)

جس طرح دارالاسلام میں تجارت کرنے والے کےحرام چیزوں کی فروخت ممنوع ہے،اسی طرح دارالاسلام سے باہر مسلمانوں کو بھی ایسی چیزوں کی تجارت نہ کرنی چاہئے مثلاً سور کا گوشت اور شراب وغیرہ۔

مسلم تاجر کو اجازت نہیں کہ وہ دار الاسلام سے کوئی ممنوع شئے دار الحرب لے جائے ۔دار الحرب میں قیام کی مدت کے اندر مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ ملک کے قوانین کے علاوہ احکام شریعت کا بھی پابند رہے ۔فقہاء کو اندیشہ تھا کہ مسلمان دار الحرب میں سفر کریں گے تو ان کے عقیدوں پر برا اثر پڑے گا لیکن حقیقتاً اس سے اشاعت اسلام میں بڑی مدد ملی۔ (ایضاً،ص۲۱۵)

عشور

عشور بھی زکوٰۃ ہی کی ایک قسم ہے ،جس کی وصول مال تجارت سے ہوتی ہے لیکن اتنا فرق ہے کہ یہ ان غیر مسلم تاجروں سے بھی وصول کیا جاتا ہے جو دار الحرب سے دار الاسلام میں بغرض تجارت مال لے کر داخل ہوں۔

(اسلام کا سیاسی نظام،ص۲۳۳)

نہ صرف غیر مسلموں سے بلکہ جو مسلمان یا ذمّی بھی دار الحرب اور دار الاسلام کے درمیان تجارتی کاروبار کو جاری رکھتے ہیں ان سے بھی یہ محصول (عشور) لیا جاتا ہے ۔بشرطیکہ تجارتی مال دوسو درہم یا بیس مثقال کی قیمت سے کم نہ ہو،ورنہ تو محصول معاف ہے ۔مسلمان اور ذمّی سے ایک مرتبہ وصول کرنے کے بعد اندرون سال دوبارہ وصول نہ کیا جائے گا،خواہ وہ کتنی ہی مرتبہ آمد ورفت کا سلسلہ جاری رکھے ،البتہ حربی کے بارے میں یہ خصوصی حکم ہے کہ

اگر ایک بار محصول چنگی وصول کئے جانے کے بعد وہ دوبارہ دارالحرب میں واپس چلا جائے ، اور ایک مہینے بعد پھر اس کا گزر محصول چنگی کے پاس سے ہوتو اگر اس کے پاس دوسو درہم یا بیس مثقال کے بقدر مال ہے تو اس سے پھر چونگی لی جائے گی ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دارالحرب میں داخل ہوتے ہی دارالاسلام کے قوانین اس پر ساقط ہو جاتے ہیں ۔ البتہ اگر اس کا مال دوسو درہم یا بیس مثقال سے کم قیمت کا ہوتو اس سے کچھ نہ لیا جائے گا۔

(اسلام کا نظام محاصل.ص۴۰۲)

عشور (محاصل چنگی) کی عام شرح حربی (یعنی باہر سے دارالاسلام میں مال لے کر آنے والے غیر مسلم) تاجر کے لئے دس فیصدی تھی ۔اور ذمّی (یعنی دارالاسلام کے غیر مسلم شہری) تاجر اور مستامن (یعنی ایک عرصہ کے لئے دار الاسلام میں اجازت لے کر رہنے والے) تاجر کے لئے پانچ فیصدی اور مسلمانوں کے لئے ڈھائی فیصدی تھی ، لیکن بعض مقامات پر اجتماعی مصالح کے پیش نظر چونگی کی شرح کم رکھی گئی تھی جیسا کہ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نبطی تاجروں سے زیتون کے تیل اور گیہوں پر پانچ فیصد وصول کرتے تھے تا کہ مدینہ میں درآمد زیادہ ہو ، حالانکہ نبطی لوگوں پر دار الاسلام کے باہر سے آنے والے ہونے کی وجہ سے دس فیصدی چنگی عائد ہونی چاہئے تھی۔

(اسلام کا نظریہ ملکیت.ص۲۱۹.ج۲)

دارالاسلام میں ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہونے والے مالوں پر عشور لینا شرعاً حرام ہے۔

(الاحکام السلطانیہ اردو.ص۲۸۰)

ذمیوں اور امان لے کر دار الاسلام میں داخل ہونے والوں سے مال تجارت کی چنگی کے طور پر جو آمدنی ہو ، یا ان کی خرید کردہ عشری زمینوں سے جو کچھ وصول کیا جائے خراج کی نوعیت رکھتا ہے ، ان کے مصارف بھی وہی ہیں جو خراج کی آمدنی کے ہیں ، ان کی نوعیت

خمس یا زکوٰۃ کے مصارف کی نہیں۔

(اسلام کا نظام محاصل.ص۳۷۷)

مال غنیمت

وہ اموال منقولہ جن پر رقبۂ جنگ میں اسلامی فوج نے اپنے اسلحہ کی طاقت سے قبضہ کیا ہو وہ اموال غنیمت ہیں۔ان کا پانچواں حصہ یعنی خمس حکومت کا حق ہے،اور باقی چار حصّے ان لوگوں کا حق ہیں جنہوں نے ان کولوٹا ہو۔امام ابو یوسف کتاب الخراج میں غنیمت کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

فهذا فيما يصيب المسلمون من عساكر اهل الشرك وما اجلبوا به من المتاع، والسلاح ، والكراع۔

خمس ان اموال میں ہے جو مسلمانوں کو اہل شرک کے لشکروں سے ہاتھ لگیں، اور ساز و سامان اور اسلحہ اور جانوروں کی قسم سے ہوں۔(یعنی اموال منقولہ)

دوسری جگہ پھر فرماتے ہیں:

فما اصآب المسلمون من عساكر اهل الشرك ، وما اجلبوا به من المتاع، والكراع، والسلاح وغير ذالک ۔

اس سے ظاہر ہوا کہ غنیمت کا اطلاق صرف ان اموال منقولہ پر ہوتا ہے جو جنگی کاروائی کے دوران میں غنیم کے لشکروں سے ہاتھ آئیں ،لشکروں کی حدود سے باہر عام آبادیوں کولوٹتے مارتے پھرنا شریعت کی نگاہ میں درست نہیں۔

(سود.ص۴۳۶)

فَے اور غنیمت کے اموال پر فاتحین کو پورے حقوق ملکیت صرف اسی وقت حاصل

ہوتے ہیں جبکہ وہ ان کو دار الحرب سے دار الاسلام منتقل کر لائیں یا دار الحرب کو دار الاسلام بنا لیں، اس سے پہلے ان اموال میں تصرف کرنا اور ان سے فائدہ اٹھانا مکروہ ہے۔

اس قید سے صرف سامان خورد ونوش اور جانوروں کا چارہ مستثنیٰ ہے۔ یعنی دوران جنگ میں جس قدر آذوقہ اور چارہ فوجوں کے ہاتھ لگے گا اس میں سے ہر مجاہد بقدر حاجت لے سکتا ہے۔اس کے سوا باقی تمام اموال غنیمت سردار لشکر کے پاس جمع کر دیئے جائیں گے اور ان کو غانمین میں اس وقت تک تقسیم نہ کیا جائے گا جب تک کہ وہ دار الاسلام کی طرف منتقل نہ کر دیئے جائیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حنفیہ کے نزدیک اموال غنیمت جب تک دار الحرب میں ہوں غانمین کی ملک ان پر مکمل نہیں ہوتی۔ امام شافعیؒ کی رائے اس کے خلاف ہے، وہ فرماتے ہیں کہ محاربین کا مال مباح ہے، اس لئے جس وقت مجاہدین اسلام ان پر قابض ہوئے اسی وقت ان کے مالک بھی ہو گئے۔ مگر امام ابو حنیفہؒ اور ان کے اصحاب فرماتے ہیں کہ یہ ملک ضعیف ہے۔ گو ہمارا قبضہ ہو چکا ہے لیکن دار تو ان کا ہے۔ جب تک مال ان کے دار سے ہمارے دار سب نہ چلا جائے ہم پوری طرح اس کے مالک نہیں ہو سکتے اس لئے کہ تکمیل ملک کے لئے محض استیلاء کافی نہیں ہے۔ امام سرخسی اس مسئلہ میں حنفیہ کے مسلک کی توضیح اس طرح کرتے ہیں:

ہمارے نزدیک نفس قبضہ سے حق صرف ثابت ہوتا ہے، دار الاسلام میں لیجانے سے مضبوط ہو جاتا ہے، اور تقسیم غنیمت سے مکمل ہو جاتا ہے۔ اس کی مثال شفعہ کی سی ہے کہ شفیع کا حق بیع سے ثابت ہوتا ہے، طلب سے مؤکد ہوتا ہے، اور قبضہ کے ساتھ مکمل ہوتا ہے، پس جب تک حق ضعیف رہے تقسیم جائز نہیں ہوتی۔ جس طرح اموال (جائداد منقولہ) پر نفس قبضہ سے ملک ثابت ہو جاتی ہے۔ مگر جس سرزمین میں مسلمانوں کے لشکر اترے ہوں اس پر حق اس وقت تک پوری طرح قائم نہیں ہوتا جب تک کہ اس کو دار الاسلام نہ بنا دیا جائے۔

اس تصریح سے معلوم ہوا کہ نہ صرف غنیمت بلکہ فئے میں بھی اسلامی حکومت اس وقت تک تصرف کا پورا حق نہیں رکھتی جب تک کہ علاقہ مقبوضہ کو دارالاسلام نہ بنا دیا جائے، یا با اصطلاح جدید اپنے مقبوضات کے ساتھ اس کے الحاق کا با قاعدہ اعلان نہ کر دیا جائے۔ نبی کریم ﷺ کا طرز عمل اسی مسلک کی تائید کرتا ہے۔ چنانچہ مکحول کا بیان ہے کہ:

ماقسم رسول الله ﷺ الغنائم الا فی دار الاسلام ۔

رسول اللہ ﷺ نے کبھی غنائم کو دارالاسلام کے سوا کہیں تقسیم نہیں فرمایا۔

(سود.ص۴۲-۴۴۱)

خُمس

غنیمت کا پانچواں حصہ اسلامی ریاست کی ضروریات اور کفالت عامہ سے متعلق مصارف کی خاطر بیت المال میں داخل کر دیا جاتا ہے اُسے خمس کہتے ہیں۔اسلام کے ابتدائی دور میں خمس یعنی مال غنیمت کا پانچواں حصّہ اسلامی ریاست کی آمدنی کا ایک اہم ذریعہ ثابت ہوا ہے۔غنیمت کے باقی چار حصے جہاد میں حصہ لینے والے مجاہدین میں تقسیم کر دیئے جاتے ہیں۔خُمس کے وجوب کے لئے مال غنیمت ہونا ضروری ہے۔

غنائم حاصل کرنے کا شرعی حق صرف انہی لوگوں کو دیا گیا ہے جو اسلامی سلطنت کے زیر حفاظت ہوں، اور جن کو امام مسلمین کی اجازت نصاً یا حکماً ہو۔ان کے سوا اگر عام مسلمان فرداً فرداً یا جماعت بنا کر بطور خود لوٹ مار کرنے لگیں تو ان کی حیثیت لٹیروں کی ہوگی۔۔ان کی غنیمت غنیمت نہ ہوگی،لوٹ ہوگی۔اس لئے اس میں سے خمس قبول نہ کیا جائے گا۔ البتہ وہ انہی کے پاس رہنے دیا جائے گا، کیونکہ دشمن کو واپس دلانا تو بہر حال ممکن نہیں ہے۔ علامہ سرخسی مبسوط میں لکھتے ہیں:

اگر ایسے لوگ جن کو امام کی حمایت حاصل نہ ہو امام کی اجازت کے بغیر غنیم کے

علاقہ میں غیر ذمہ دارانہ طور پر داخل ہوں، اور مال لوٹیں تو ہمارے نزدیک اس مال میں سے خمس نہ لیا جائے گا۔

(سود۔ص۴۳۹)

فَئ

غنیمت اور فَے میں یہ فرق ہے کہ جو اموال جنگ کے دوران دشمن کے لشکر سے لڑکر حاصل کئے گئے ہوں وہ غنیمت ہیں۔ اور فَے ان اموال منقولہ وغیرمنقولہ کو کہتے ہیں جو جنگ کے بعد نتیجۂ فتح کے طور پر حاصل ہوں۔امام ابوعبید کتاب الاموال میں لکھتے ہیں:

ما ينل من اهل الشرك عنوة قسر او الحرب قائمة فهو الغنيمة ، وما نيل منهم بعد ما تضع الحرب اوزارها وتصير الدار دار الاسلام فهو فيئ يكون للناس عاما ولا خمس فيه۔

جو مال دشمن سے بزور ہاتھ لگے جب کہ ابھی جنگ ہو رہی ہو وہ غنیمت ہے، اور جنگ ختم ہونے کے بعد جب ملک دار الاسلام بن گیا ہو اس وقت جو مال ہاتھ لگے وہ فَے ہے، جسے عام باشندگان دار الاسلام کے لئے وقف ہونا چاہئے ،اور اس میں خمس نہیں ہے۔

(تفہیم القرآن۔ج۵۔ص۳۹۰)

غنیمت کا حکم یہ ہے کہ اس کے پانچ حصے کئے جائیں ، چار حصے لڑنے والی فوج میں تقسیم کر دیئے جائیں ، اور ایک حصّہ بیت المال میں داخل کر دیا جائے ۔ جب کہ فَے کا حکم یہ ہے کہ اسے فوج میں تقسیم نہ کیا جائے ، بلکہ پورے کا پورا بیت المال میں داخل کر دیا جائے ،یعنی اُسے سب مسلمانوں کے مصالح میں صرف کیا جائے ۔

وراثت

کتب فقہ کی رو سے دار (ملک) کا اختلاف بھی مانع ارث ہے، یعنی ایک کافر ذمّی دار الکفر میں ہو، اور دوسرا دار الاسلام میں تو باہم میراث جاری نہ ہوگی ۔ میراث کے باب میں دار الاسلام و دارلکفر کے یہ معنیٰ ہیں کہ ہر دوممالک کے سر براہ اپنی فوج، قوانین، املاک اورحکومت میں ایک دوسرے کے مقابل تغلب سے کھڑے ہو سکتے ہوں، دونوں کے نزدیک ایک دوسرے سے جنگ کرنا جائز ہو، کیونکہ ایسی حالت میں ان ملکوں کی باہمی عصمت منقطع ہوجاتی ہے ۔ اختلافِ دار غیر اہل اسلام میں معتبر ہے، مثلاً حربی، ذمی یا مستأمن ۔

اختلاف دار کی دوصورتیں ہیں، حقیقی اختلاف اورحکمی اختلاف ۔ لیکن ہر دوصورتوں میں حکم یہی ہے کہ یہ اختلاف ارث کا مانع ہوگا ۔ البتہ مسلمانوں میں اختلاف دار مانع ارث نہیں ہے ۔ اختلاف دار کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص دار الاسلام کی حدود میں اس کا شہری ہو، اور دوسرا دار الکفر کی حدود میں رہ کر وہاں کا شہری ہو ۔ چنانچہ اگر وارث ومورث مختلف دار سے تعلق رکھتے ہیں تو غیر مسلم ہونے کی صورت میں باہم وارث نہ ہوں گے، جیسے حربی، وذمّی ومستأمن جومختلف ملکوں کے ہوں کہ ایک دار الاسلام میں حکومت اسلامی کا مطیع ہو کر جزیہ دے کر یہاں کا شہری ہو، اور دوسرا غیر مسلم دار الکفر کا شہری ہو، تو ایک کودوسرے کی میراث نہیں ملے گی ۔ بالفاظ دیگر دار الکفر میں غیر مسلم مراتو دار الاسلام کا غیر مسلم شہری کا باپ یا بیٹا وارث نہ ہوگا ۔ اسی طرح اگر دار الاسلام میں ذمّی (یعنی دار الاسلام کا غیر مسلم شہری) مراتو دار الکفر میں رہنے والا اس ذمّی کا باپ یا بیٹااس کا وارث نہ ہوگا ۔ اس لئے کہ ان دونوں میں حقیقی معنیٰ کے اعتبار سے اختلافِ دار ہے، اگر چہ ملّت میں متحد ہیں ۔

اگر حربی (دار الکفر کا کافر شہری) دار الاسلام میں مال لے کر آیااور مر گیا تو اس سے وراثت کا رشتہ رکھنے والا ذمّی اس کا وارث نہ ہوگا ۔ بلکہ حربی کافر نے جو مال چھوڑا ہواس

کے ملک کو بھیج دیا جائے گا۔ اگر دار الاسلام میں ذمّی فوت ہو گیا جس کا دار الاسلام میں کوئی وارث نہیں البتہ دار الکفر میں موجود ہے تو اس ذمّی کا ترکہ بیت المال میں جمع کر دیا جائے گا۔ دار الکفر کے رہنے والوں کو وراثت نہ ملے گی، کیونکہ ان میں حکماً اختلاف دار موجود ہے اگر چہ اس وقت دونوں ایک ہی ملک میں موجود ہوں بخلاف اس صورت کے کہ جب کوئی مسلمان دار الکفر میں جا کر مرے یا مسلم دار الاسلام میں مرے، اور اس کے (مسلمان) وارث دار الکفر میں ہوں تو دار الاسلام کے وارث اس کے ترکہ کے وارث ہوں گے کیونکہ اختلافِ دار کا قانون غیر مسلموں کے لئے ہے۔ اسی طرح اگر ذمّی کافر دار الکفر میں اجازت لے کر گیا اور اس کے ورثا دار الاسلام میں موجود نہیں تو یہ دار الاسلام کا متروکہ بیت المال کا حق ہو گا، دار الکفر کے ورثا کو نہ ملے گا۔

امام شافعیؒ کے نزدیک اختلاف دار مانع ارث نہیں ہے۔ امام احمد بن جنبل کا مسلک بھی امام شافعیؒ کے موافق ہے۔ مالکی کتب فقہ کی عبارتوں سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مسلک شافعیہ وحنبلیہ کے مطابق ہے۔ کیونکہ ان کے کتب میں اختلاف دار کے متعلق کسی قسم کا تعرض نہیں کیا گیا۔

اختلاف دار کے سلسلہ میں احناف ایک غیر مسلم کا وارث صرف اس صورت میں تسلیم کرتے ہیں جبکہ وارث و مورث (غیر مسلم) میں کوئی اختلاف دار نہ ہو۔ اگر اختلاف دار موجود ہو تو غیر مسلم مورث (ذمی) کا ترکہ دار الکفر میں رہنے والے غیر مسلم وارث کو نہیں دیتے، اور یہی حکم اس کے برعکس صورت میں لگاتے ہیں، یعنی اگر دار الکفر میں کوئی غیر مسلم مر جائے اور اس کا وارث غیر مسلم ذمّی دار الاسلام کا شہری ہو تو اس صورت میں بھی ان کے نزدیک وراثت جاری نہیں ہوتی۔

(مجموعۂ قوانین اسلام، ج ۵، ص ۳۲-۱۹۲۹)

دار الاسلام اور دار الکفر کے مسلمانوں میں وراثت کے مسئلے میں مولانا مودودی کی تحقیق مختلف ہے، اس مسئلے پر مولانا ظفر احمد عثمانیؒ سے ان کی طویل مراسلت ہوئی ہے، اور وہ ان کی کتاب رسائل و مسائل میں درج ہے، چنانچہ مولانا مودودی لکھتے ہیں:

دار الاسلام کی حکومت اور مسلم رعایا اور دار الکفر کی مسلم رعایا کے باہمی تعلقات کا معاملہ محض قانونی نہیں ہے بلکہ اس کے اندر سیاسی اور بین الاقوامی تعلقات کے مسائل بھی ساتھ ساتھ الجھے ہوئے ہیں۔ ایک مسلمان جو دار الاسلام کی رعایا ہے اگر دار الکفر کے کسی شخص کا وارث ہو اور اس کا مفاد اس وراثت سے وابستہ ہو جائے تو ہوسکتا ہے کہ یہی وابستگی اس کے لئے فتنہ بن جائے۔

(رسائل و مسائل،ج۲،ص۱۶۳)

آگے چل کر پھر لکھتے ہیں اس معاملہ میں متعدد معاشی پیچیدگیاں بھی ہیں، دار الکفر کی حکومت اپنے علاقہ میں دار الاسلام کی رعایا کے حقوق مالکانہ ساقط کرسکتی ہے یا ان کو طرح طرح کی پابندیوں سے محدود کرسکتی ہے، اور دار الاسلام کی طرف دولت کے منتقل ہونے کو روک سکتی ہے مگر ہم دار الاسلام میں دار الکفر کے ایک مسلمان کے حقوق وراثت شرعاً مان لینے کے بعد انہیں کیسے ساقط کرسکیں گے۔

(ایضاً،ج۲،ص۱۶۴)

اس مسئلہ میں ان کی ختمی رائے یہ ہے کہ:

دار الکفر اور دار الاسلام کے مسلمان ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے، الا یہ کہ دونوں حکومتوں اور قوموں کے درمیان قابل اعتماد دوستانہ تعلقات ہوں، اور ان کے درمیان املاک اور مواریث کے بارے میں مساویانہ معاہدات بھی ہوجائیں تاکہ دونوں کی رعایا ایک دوسرے کی مملکت میں جائدادوں کی مالک و متصرف ہو سکے۔

(ایضاً،ج۲،ص۱۶۶)

مرتد اگر مارا جائے یا مر جائے ، یا درالحرب میں رہ پڑے تو جو کچھ اس نے حالت اسلام میں کمایا ہے وہ اس کے مسلمان ورثاء کی میراث قرار پائے گا، اور جو کچھ حالت ارتداد میں کمایا ہے وہ بیت المال کی ملکیت ہوگا۔

جب زوجین ایک ساتھ مرتد ہو جائیں اور پھر ان سے بچے پیدا ہوں تو اگر مرتد ہونے کے دن سے چھ ماہ کے اندر بچہ پیدا ہوا ہوتو اس کو میراث ملے گی ، کیونکہ یہ امر اس بات کا یقینی ثبوت ہے کہ وہ اپنی ماں کے بطن میں اس وقت موجود تھا جبکہ اس کے والدین مسلمان تھے ،اس لئے وہ اسلام کا تابع قرار دیا جائے گا جبکہ وہ دار الاسلام میں رہے۔

اگر زوجین یا ان میں سے کوئی ایک مرتد ہو جائے تو ان کے درمیان باہم وراثت جاری نہیں ہوگی ،خواہ وہ دار الحرب میں چلے گئے ہوں یا دار الاسلام میں مقیم ہوں ۔ جب مرتد دار الکفر میں چلا جائے تو ایسی صورت میں اس کا مال موقوف رکھا جائے گا ، اگر اسلام لے آیا تو مال اس کے سپرد کر دیا جائے گا، اور اگر مر گیا تو وہ غنیمت تصور کیا جائے گا۔

اہل عراق (حنفیہ) کے نزدیک دار الکفر میں چلا جانا ہی زوال ملک کا سبب ہوگا ، اس لئے مرتد کی واپسی کے بعد مال واپس نہ ہوگا۔ اگر اسلام کی طرف واپس آجائے تو جو مال باقی ہوگا وہ لے لے گا، اور ورثاء نے جو صرف کر دیا ہوگا وہ واپس نہ ہوگا۔

(مجموعہ قوانین اسلام ج۵ ص۱۹۳۳-۳۶)

وصیّت

حصول ملکیت کی ایک شکل وصیت بھی ہے جس کے ذریعہ مالک کے مرنے کے بعد متعلقہ ملکیت اس شخص کی طرف منتقل ہوجاتی ہے جس کے حق میں وصیت کی گئی ہو۔ وصیت کی صحت کے لئے دین وملّت کا متحد ہونا ضروری نہیں ، اور اسی بنا پر ایک مسلم کی وصیت غیر مسلم کے حق میں صحیح قرار دی گئ ہے ۔ البتہ اس قسم کی وصیت میں یہ شرط ضروری ہے کہ غیر مسلم یا تو

ذمّی (دار الاسلام کا مستقل شہری) ہو یا یہ کہ مستأمن (اجازت لے کر عارضی طور پر دار الاسلام میں آیا ہوا ہو)۔اگر غیر مسلم حربی ہے تو اس کے حق میں وصیت صحیح نہ ہوگی کیونکہ اس کے نفاذ سے جنگ میں اعانت کرنا لازم آئے گا۔

(مجموعہ قوانین اسلام ،ج ۴،ص ۱۳۱۲)

موصی کے لئے بھی مسلمان ہونا شرط نہیں ہے،لہٰذا مسلم اور ذمّی (دارالاسلام کا غیر مسلم شہری) وصیت کرنے کے اہل ہیں،اسی طرح اگر کوئی غیر مسلم جو دارالاسلام میں اجازت حاصل کر کے آیا ہو وصیت کر سکتا ہے، بشرطیکہ اس نے کسی مسلم یا ذمی کے حق میں وصیت کی ہو،لیکن اگر موصی لہٗ حربی ہے تو اس کے لئے وصیت اس بنا پر صحیح نہ ہوگی کہ یہ جنگ میں اعانت کا باعث ہوگا،حربیوں کے لئے وصیت باطل ہے۔

(ایضا،ج ۴،ص ۱۳۰۴)

سود کی حرمت

قرض میں دیئے ہوئے رأس المال پر جو زائد رقم مدت کے مقابلہ میں شرط اور تعین کے ساتھ لی جائے وہ سود ہے۔رأس المال پر اضافہ، اضافہ کی تعین، مدت کے لحاظ سے کیئے جانا اور معاملہ میں اس کا مشروط ہونا یہ تین اجزائے ترکیبی ہیں،جن سے سود بنتا ہے۔اور ہر وہ معاملۂ قرض جس میں یہ تینوں اجزا پائے جاتے ہوں ایک سودی معاملہ ہے۔

(سود،ص ۱۵۳)

قرآن مجید میں اس کے لئے"الربا" کا لفظ استعمال ہوا ہے،اور اسے حرام ٹھرایا گیا ہے، اسی بنا پر نبی ﷺ نے اسلامی قلمرو میں سود کو روکنے کے لئے سخت کوشش فرمائی ، آپ ﷺ نے نجران کے عیسائیوں سے جو معاہدہ کیا اس میں صاف طور پر لکھ دیا کہ اگر تم سودی کاروبار کرو گے تو معاہدہ کالعدم ہو جائے گا،اور ہم کو تم سے جنگ کرنی پڑے گی۔

اسلامی ریاست میں ذمّی کافروں کوسودی لین دین کی اجازت نہیں ، اور اگر کوئی حربی کافر دار الاسلام میں امان لے کر آئے تو اسے بھی سودی کاروبار کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی ۔ گویا دار الاسلام میں کفار کوبھی اس بات کی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ سودی لین دین کورواج دیں ، اس میں تمام فقہائے امت کا اتفاق ہے ۔

جمہور علماء کے نزدیک سود کی حرمت بالکل مطلق اورغیر مشروط ہے ، اس میں دار الاسلام یا دارالحرب کی کوئی تخصیص نہیں بلکہ ہرجگہ یہ معاملہ حرام ہے ۔مگر امام ابوحنیفہؒ اورامام محمد کا مسلک یہ ہے کہ دار الحرب میں کافرحربی سے سودی لین دین درست ہے ۔ ان کے نزدیک ربا ان اشخاص کے درمیان حرام ہے جومسلمان ہوں ، یا اسلامی حکومت کے زیر اقتدار زندگی بسر کر رہے ہوں ۔حکومت اسلامیہ کے دائرے میں بسنے والے تین قسم کے لوگ ہوتے ہیں، مسلمان، ذمی، اور مستأمن ۔ ربا انہی تین قسم کے لوگوں کے درمیان حرام ہے ۔اب اگر کوئی مسلمان اسلامی دائرہ حکومت سے نکل کر دار الحرب میں حکومت کافرہ سے امن و امان لے کر داخل ہوتو اس مسلمان اورحربیوں کے درمیان نہ صرف یہ کہ ربا جائز ہے بلکہ تمام عقود فاسدہ جائز ہیں ۔

اس مسلمان پر بس اتنی ہی پابندی ہے کہ حربیوں سے غدر و بیوفائی نہ کرے ، اوران کے قانون کا پابند رہے ۔ اس کے علاوہ ان کی رضامندی سے جس طرح بھی ممکن ہو، وہ ان کے اموال حاصل کرسکتا ہے ، اور وہ حاصل کردہ اموال اس کے لئے حلال وطیب ہیں ۔ اسی طرح اگر کوئی حربی بغیر امان دار الاسلام میں داخل ہوتو اس سے تمام عقود فاسدہ درست ہیں، غرضیکہ حربی سے بطیب خاطر اس کے اموال کی تحصیل جائز ہے چاہے جیسے بھی ممکن ہو۔

(ترجمان القرآن جنوری ۱۹۴۷سنۂء ، ص ۲۰)

لیکن جمہور کا مسلک یہی ہے کہ سود کا لینا دینا دار الاسلام اور دار الحرب دونوں میں

حرام ہے۔مولانا مودودی بھی جمہور فقہائے امت کی رائے کو اس معاملہ میں ترجیح دیتے ہیں، چنانچہ وہ اپنی کتاب سود میں لکھتے ہیں:

سود اپنی فطرت کے لحاظ سے زکوۃ کی ضد ہے، اور اس نفسیاتی حقیقت میں کسی ملک کے دارالحرب یا دارالاسلام ہونے سے کوئی تفاوت نہیں ہوتا۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ ایک ہی معاشی زندگی میں دونوں جمع ہو جائیں۔

(سود، ص۳۹۱)

نیز وہ اپنی کتاب رسائل و مسائل میں لکھتے ہیں:

جس سرزمین میں باطل کا غلبہ ہو، اور احکام کفر جاری ہو رہے ہوں وہاں ہمارا کام باطل کے طریقوں کو اختیار کر لینا نہیں ہے، بلکہ ہمارا اصلی منصب یہ ہے کہ ہم وہاں رہ کر قرآن کے قانون حیات کی تبلیغ کریں، اور نظام کفر کی جگہ نظام اسلامی قائم کرنے کے لئے مساعی ہوں۔ اب غور کیجئے کہ اگر ہم خود سود کھائیں گے تو کفار کی سودخواری کے خلاف آواز کس منہ سے اٹھائیں گے؟ کفار اگر ناجائز طریقوں سے ہمارے اموال لے رہے ہیں، یا حکومت کفر ہمارے اموال سے اگر بلا استحقاق (یعنی قدر کی سند پر مبنی حق کے بغیر) کوئی حصہ لے اُڑتی ہے تو ہمارے لئے یہ کیسے روا ہو سکتا ہے کہ ہم ان اموال کو واپس لینے کے لئے ویسے ہی ناجائز کاروائیاں کرنے لگیں، اور کسبِ حرام کو اپنا حق واپس لینے کا ذریعہ بنائیں۔ پھر ہم میں اور کفار میں وہ کونسا فرق باقی رہ جاتا ہے جس کے بل پر دارالکفر کو دار الاسلام میں تبدیل کرنے کی جدوجہد کر سکیں۔

(رسائل و مسائل، ج۱، ص۱۵۳)

دار الاسلام
اور عائلی
قوانین

دارالاسلام اور عائلی قوانین

عائلی قانون

فقہائے اسلام نے اس قانون کو چار بڑے بڑے عنوانات کے تحت مرتب کیا ہے
ایک وہ حالت جس میں زوجین دار الاسلام میں ہوں اور ان میں سے ایک مسلمان ہو جائے اور دوسرا کافر رہے۔

دوسرے وہ حالت جس میں زوجین میں سے کوئی ایک دار الکفر میں مسلمان ہو جائے، اور دوسرا کافر رہے۔

تیسرے وہ حالت جس میں زوجین میں سے کوئی ایک مسلمان ہوکر دارالاسلام میں ہجرت کر کے آجائے، اور دوسرا دارالکفر میں کافر رہے۔

چوتھے وہ حالت جس میں مسلم زوجین میں سے کوئی ایک مرتد ہوجائے۔ذیل میں ان چاروں حالتوں کے متعلق فقہاء کے مسالک الگ الگ بیان کئے جاتے ہیں۔

(1) پہلی صورت میں اگر اسلام شوہر نے قبول کیا ہو اور اس کی بیوی عیسائی یا یہودی ہو اور وہ اپنے دین پر قائم رہے تو دونوں کے درمیان نکاح باقی رہے گا، کیونکہ مسلمان مرد کے لئے اہل کتاب بیوی جائز ہے۔یہ امر تمام فقہاء کے درمیان متفق علیہ ہے۔اور اگر اسلام قبول کرنے والے مرد کی بیوی غیر اہل کتاب میں سے ہو، اور وہ اپنے دین پر قائم رہے تو حنفیہ اس کے متعلق کہتے ہیں کہ عورت کے سامنے اسلام پیش کیا جائے گا، قبول کر لے تو نکاح باقی رہے گا، نہ قبول کرے تو ان کے درمیان تفریق کر دی جائے گی۔اس صورت میں اگر زوجین کے درمیان خلوت ہو چکی ہو تو عورت مہر کی مستحق ہو گی، اور خلوت نہ ہوئی ہو تو اس کو مہر پانے کا حق نہ ہوگا۔کیونکہ فرقت اس کے انکار کی وجہ سے واقع ہوئی ہے۔

امام شافعی اور امام احمد کہتے ہیں، اگر زوجین کے درمیان خلوت نہ ہوئی ہوتو مرد کے اسلام قبول کرتے ہی عورت اس کے نکاح سے باہر ہو جائے گی ، اور اگر خلوت ہو چکی ہوتو عورت تین مرتبہ ایام ماہواری آنے تک اس کے نکاح میں رہے گی ۔اس دوران میں وہ خود اپنی مرضی سے اسلام قبول کر لےتو نکاح باقی رہے گا، ورنہ تیسری بار ایام سے فارغ ہوتے ہی آپ سے آپ فسخ ہو جائے گا۔

امام شافعیؒ یہ بھی فرماتے ہیں کہ ذمیوں کو ان کے مذہب سے تعرض نہ کرنے کی جو ضمانت ہماری طرف سے دی گئی ہے اس کی بنا پر یہ درست نہیں ہے کہ عورت کے سامنے اسلام پیش کیا جائے ،لیکن درحقیقت یہ ایک کمزور بات ہے ۔کیونکہ ایک ذمّی عورت کے مذہب سے تعرض تو اس صورت میں ہوگا جبکہ اس کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے ۔اس سے صرف یہ کہنا کوئی بے جا تعرض نہیں ہے کہ تو اسلام قبول کر لےتو اپنے شوہر کے ساتھ رہ سکے گی ،ورنہ تجھے اس سے الگ کر دیا جائے گا۔

حضرت علیؓ کے زمانہ میں اس کی نظیر بھی آ چکی ہے ۔عراق کے ایک مجوسی زمیندار نے اسلام قبول کیا اور اس کی بیوی کافر رہی ،حضرت علیؓ نے اس کے سامنے اسلام پیش فرمایا اور جب اس نے انکار کیا تب آپ نے دونوں کے درمیان تفریق کرادی۔

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اگر خلوت نہ ہو چکی ہوتو مرد کے اسلام لاتے ہی اس کی کافر بیوی اس سے فوراً جدا ہو جائے گی ،اور اگر خلوت ہو چکی ہوتو عورت کے سامنے اسلام پیش کیا جائے گا ،اور اس کے انکار کی صورت میں جدائی واقع ہو جائے گی ۔

اور اگر اسلام عورت نے قبول کیا ہو اور مرد کافر رہے ،خواہ وہ اہل کتاب میں سے ہو یا غیر اہل کتاب میں سے ،تو حنفیہ کہتے ہیں کہ دونوں میں خلوت ہو چکی ہو یا نہ ہوئی ہو، ہر صورت میں شوہر کے سامنے اسلام پیش کیا جائے گا۔قبول کرے تو عورت اس کے نکاح میں

رہے گی، انکار کردے تو قاضی دونوں میں تفریق کرا دے گا۔اس دوران میں جب تک مرد اسلام سے انکار نہ کرے عورت اس کی بیوی تو رہے گی مگر اس کو مقاربت کا حق نہ ہوگا۔شوہر کے انکار کی صورت میں تفریق طلاق بائن کے حکم میں ہوگی ۔اگر اس سے پہلے خلوت نہ ہوئی ہوتو عورت نصف مہر پانے کی حقدار ہوگی ،اور خلوت ہو چکی ہوتو عورت پورا مہر بھی پائے گی ، اور عدّت کا نفقہ بھی۔

امام شافعیؒ کے نزدیک خلوت نہ ہونے کی صورت میں عورت کے اسلام قبول کرتے ہی نکاح فسخ ہو جائے گا، اور خلوت ہونے کی صورت میں عدّت ختم ہونے تک عورت اس مرد کے نکاح میں رہے گی۔اس مدّت کے اندر وہ اسلام قبول کر لے تو نکاح باقی رہے گا، ورنہ عدت کے گذرتے ہی جدائی واقع ہو جائے گی۔لیکن مرد کے معاملہ میں بھی امام شافعیؒ نے وہی رائے ظاہر کی ہے جو عورت کے معاملہ میں اوپر منقول ہوئی کہ اس کے سامنے اسلام پیش کرنا جائز نہیں ہے، اور یہ مسلک بہت کمزور ہے۔

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں متعدد واقعات ایسے پیش آئے ہیں کہ عورت نے اسلام قبول کر لیا اور مرد سے اسلام لانے کے لئے کہا گیا، اور جب اس نے انکار کر دیا تو دونوں کے درمیان تفریق کرا دی گئی ،مثلاً بنی تغلب کے ایک عیسائی کی بیوی کا معاملہ ان کے سامنے پیش ہوا ، انہوں نے مرد سے کہا یا تو تو اسلام قبول کر لے ، ورنہ میں تم دونوں کے درمیان تفریق کردوں گا۔ اس نے انکار کیا،اور آپ نے تفریق کی ڈگری دے دی۔ یہ واقعات صحابہ کرامؓ کے سامنے پیش آئے تھے اور کسی کا اختلاف منقول نہیں ہے۔

امام مالکؒ کی رائے اس معاملہ میں یہ ہے کہ اگر خلوت سے پہلے عورت مسلمان ہو جائے تو شوہر کے سامنے اسلام پیش کیا جائے ،وہ قبول کر لے تو بہتر ورنہ فوراً تفریق کرا دی جائے ، اور اگر خلوت ہو چکی ہو اور اس کے بعد عورت اسلام لائی ہو تو زمانۂ عدت ختم ہونے

تک انتظار کیا جائے ، اس مدت میں شوہر اسلام قبول کر لے تو نکاح باقی رہے گا، ورنہ عدت گزرتے ہی فرقت واقع ہوجائے گی۔

امام احمدؒ کا ایک قول امام شافعیؒ کی تائید میں ہے، اور دوسرا قول یہ ہے کہ زوجین کے درمیان اختلاف دین واقع ہوجانا بہرحال فوری تفریق کا موجب ہے، خواہ خلوت ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔

(2) دارالکفر میں اگر عورت مسلمان ہوجائے اور مرد کافر رہے، یا مرد مسلمان ہوجائے اور اس کی بیوی (جو عیسائی یا یہودی نہ ہو بلکہ کسی غیر کتابی مذہب کی ہو) اپنے مذہب پر قائم رہے تو حنفیہ کے نزدیک خواہ ان کے درمیان خلوت ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو تفریق واقع نہیں ہوگی جب تک عورت کو تین مرتبہ ایّام ماہواری نہ آجائے، یا اس کے غیر حائضہ ہونے کی صورت میں تین مہینے نہ گزر جائیں، اس دوران میں اگر دوسرا فریق بھی مسلمان ہوجائے تو نکاح باقی رہے گا، ورنہ یہ مدّت گزرتے ہی فرقت واقع ہوجائے گی۔

امام شافعیؒ اس معاملہ میں بھی خلوت اور عدم خلوت کے درمیان فرق کرتے ہیں، ان کی رائے یہ ہے کہ اگر خلوت نہ ہوئی ہو تو زوجین کے درمیان دین کا اختلاف واقع ہوتے ہی فرقت ہوجائے گی، اور اگر خلوت ہوجانے کے بعد دین کا اختلاف رونما ہوا ہو تو عدت کی مدّت ختم ہونے تک ان کا نکاح باقی رہے گا، اس دوران میں اگر دوسرا فریق اسلام قبول نہ کرے تو عدت ختم ہونے کے ساتھ ہی نکاح بھی ختم ہوجائے گا۔

(3) جس صورت میں زوجین کے درمیان اختلاف دین کے ساتھ اختلاف دار بھی واقع ہوجائے یعنی ان میں سے کوئی ایک دارالکفر میں کافر رہے، اور دوسرا دارالاسلام کی طرف ہجرت کر جائے ، اس کے متعلق حنفیہ کہتے ہیں کہ دونوں کے درمیان نکاح کا تعلق آپ سے آپ ختم ہوجائے گا۔ اگر ہجرت کرنے والی عورت ہو تو اسے فوراً دوسرا نکاح کر لینے

کا حق حاصل ہے ، اس پر کوئی عدت نہیں ہے ، البتہ مقاربت کے لئے اس کے شوہر کو استبرائے رحم کی خاطر ایک مرتبہ ایام ماہواری آجانے تک انتظار کرنا ہوگا ، اور اگر وہ حاملہ ہوتو بھی نکاح ہوسکتا ہے ، مگر مقاربت کے لئے وضع حمل تک انتظار کرنا ہوگا ۔

امام ابو یوسف اور امام محمد نے اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہؒ سے صرف اتنا اختلاف کیا ہے کہ ان کے نزدیک عورت پر عدت لازم ہے ، اور اگر وہ حاملہ ہوتو وضع حمل سے پہلے اس کا نکاح نہیں ہوسکتا ۔ امام شافعیؒ امام احمد اور امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اختلاف دار کا اس معاملہ میں کوئی دخل نہیں ہے بلکہ اصل چیز اختلاف دین ہے ، یہ اختلاف اگر زوجین میں واقع ہو جائے تو احکام وہی ہیں جو دار الاسلام میں زوجین کے درمیان یہ اختلاف واقع ہونے کے احکام ہیں ۔ امام شافعیؒ اپنی مذکورہ بالا رائے کے ساتھ ہجرت کر کے آنے والی مسلمان عورت کے معاملہ میں یہ رائے بھی ظاہر کرتے ہیں کہ اگر وہ اپنے کافر شوہر سے لڑ کر اس کے حق زوجیت کو ساقط کرنے کے ارادے سے آئی ہوتو اختلاف دار کی بنا پر نہیں بلکہ اس کے اس قصد کی بنا پر فوراً فرقت واقع ہو جائے گی ۔ لیکن قرآن مجید کی آیت نمبر دس سورۃ الممتحنہ پر غور کرنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں صحیح ترین رائے وہی ہے جو امام ابوحنیفہؒ نے ظاہر فرمائی ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت ہجرت کر کے آنے والی مؤمن عورتوں ہی کے بارے میں نازل فرمائی ہے ، اور انہی کے حق میں یہ فرمایا ہے کہ وہ اپنے ان کافر شوہروں کے لئے حلال نہیں رہیں جنہیں وہ دارالکفر میں چھوڑ آئیں ہیں ، اور دار الاسلام کے مسلمانوں کو اجازت دی ہے کہ وہ ان کے مہر ادا کر کے ان سے نکاح کر لیں ۔ دوسری طرف مہاجر مسلمانوں سے خطاب کر کے یہ فرمایا ہے کہ اپنی ان کافر بیویوں کو اپنے نکاح میں نہ روکے رکھو جو دار الکفر میں رہ گئی ہیں ، اور کفار سے اپنے وہ مہر واپس مانگ لو جو تم نے ان عورتوں کو دیئے تھے ۔ ظاہر ہے کہ یہ صرف اختلاف دین ہی کے احکام نہیں ہیں بلکہ ان احکام کو جس چیز نے یہ

خاص شکل دے دی ہے وہ اختلاف دار ہے۔ اگر ہجرت کی بنا پر مسلمان عورتوں کے نکاح ان کے کافر شوہروں سے ٹوٹ نہ گئے ہوتے تو مسلمانوں کو ان سے نکاح کر لینے کی اجازت کیسے دی جا سکتی تھی، اور وہ بھی اس طرح کہ اس اجازت میں عدت کی طرف کوئی اشارہ تک نہیں ہے۔

اسی طرح اگر "لَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ" کا حکم آجانے کے بعد بھی مسلمان مہاجرین کی کافر بیویاں ان کے نکاح میں باقی رہ گئی ہوتیں تو ساتھ ساتھ یہ حکم بھی دیا جاتا کہ انہیں طلاق دے دو، مگر یہاں اس کی طرف بھی کوئی اشارہ نہیں ہے۔ بلاشبہ یہ صحیح ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد حضرت عمرؓ اور حضرت طلحہؓ اور بعض دوسرے مہاجرین نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی تھی، مگر یہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ ان کے لئے ایسا کرنا ضروری تھا، اور ان بیویوں کے ساتھ تعلق زوجیت کا انقطاع ان کے طلاق دینے پر موقوف تھا، اور اگر وہ طلاق نہ دیتے تو وہ بیویاں ان کے نکاح میں باقی رہ جاتیں۔

(4) چوتھا مسئلہ ارتداد کا ہے، اس کی ایک صورت یہ ہے کہ زوجین ایک ساتھ مرتد ہو جائیں، اور دوسری صورت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی ایک مرتد ہو اور دوسرا مسلمان رہے۔ اگر زوجین ایک ساتھ مرتد ہو جائیں تو شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ خلوت سے پہلے ایسا ہو تو فوراً، اور خلوت کے بعد ہو تو عدت کی مدّت ختم ہوتے ہی دونوں کا وہ نکاح ختم ہو جائے گا جو حالت اسلام میں ہوا تھا۔ اس کے برعکس حنفیہ کہتے ہیں کہ اگرچہ قیاس یہی کہتا ہے کہ ان کا نکاح فسخ ہو جائے لیکن حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں جو فتنۂ ارتداد برپا ہوا تھا اس میں ہزار ہا آدمی مرتد ہوئے اور پھر مسلمان ہو گئے، اور صحابہ کرامؓ نے کسی کو بھی تجدید نکاح کا حکم نہیں دیا، اس لئے ہم صحابہ کے متفقہ فیصلے کو قبول کرتے ہوئے خلاف قیاس یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ زوجین کے ایک ساتھ مرتد ہونے کی صورت میں ان کے نکاح نہیں ٹوٹتے۔

اگر شوہر مرتد ہو جائے اور عورت مسلمان رہے تو حنفیہ اور مالکیہ کے نزدیک فوراً نکاح ٹوٹ جائے گا خواہ ان کے درمیان پہلے خلوت ہو چکی ہو یا نہ ہوئی ہو۔لیکن شافعیہ اور حنابلہ اس میں خلوت سے پہلے اور خلوت کے بعد کی حالت کے درمیان فرق کرتے ہیں۔اگر خلوت سے پہلے ایسا ہوا ہوتو فوراً نکاح فسخ ہو جائے گا، اور خلوت کے بعد ہوا ہوتو زمانۂ عدت تک باقی رہے گا۔اس دوران میں وہ شخص مسلمان ہو جائے تو زوجیت برقرار رہے گی، ورنہ عدت ختم ہوتے ہی اس کے ارتداد کے وقت سے نکاح فسخ شدہ شمار کیا جائے گا۔یعنی عورت کو پھر کوئی نئی عدت گزارنی نہ ہوگی۔ چاروں فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ خلوت سے پہلے یہ معاملہ پیش آیا ہوتو عورت کو نصف مہر، اور خلوت کے بعد پیش آیا ہوتو پورا مہر پانے کا حق ہوگا۔اور اگر عورت مرتد ہوگئی ہوتو حنفیہ کا قدیم فتویٰ یہ تھا کہ اس صورت میں بھی نکاح فوراً فسخ ہو جائے گا، لیکن بعد کے دور میں علمائے بلخ اور سمرقند نے یہ فتویٰ دیا کہ عورت کے مرتد ہونے سے فوراً فرقت واقع نہیں ہوتی، اور اس سے ان کا مقصد اس امر کی روک تھام کرنا تھا کہ شوہروں سے پیچھا چھڑانے کے لئے عورتیں کہیں ارتداد کا راستہ اختیار نہ کرنے لگیں۔

مالکیہ کا فتویٰ بھی اس سے ملتا جلتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ اگر قرائن یہ بتا رہے ہوں کہ عورت نے محض شوہر سے علیحدگی حاصل کرنے کے لئے بطور حیلہ ارتداد اختیار کیا ہے تو فرقت واقع نہ ہوگی۔شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ عورت کے ارتداد کی صورت میں بھی قانون وہی ہے جو مرد کے ارتداد کی صورت میں ہے۔یعنی خلوت سے پہلے مرتد ہوتو فوراً نکاح فسخ ہو جائے گا، اور خلوت کے بعد ہوتو زمانہ عدت گزرنے تک نکاح باقی رہے گا۔اس دوران میں وہ مسلمان ہو جائے تو زوجیت کا رشتہ برقرار رہے گا، ورنہ عدت گزرتے ہی نکاح وقت ارتداد سے فسخ شمار ہوگا۔

(تفہیم القرآن،ج۵،ص۴۴۳-۴۳۸)

دار الحرب میں چلے جانے والے مرتد کی بیوی (اگر دار الاسلام میں موجود ہوتو اس) سے اس کا تعلق منقطع کر دیا جائے گا، اور اس عورت سے کہا جائے گا کہ جس دن اس کا شوہر اسلام سے مرتد ہوا تھا، اس دن سے تین حیض کی مدت تک اس کی عدت پوری کرے۔ اگر وہ حاملہ ہوتو اس وقت تک عدت پوری کرے جب تک وضع حمل نہ ہو جائے۔اس کے بعد چاہے تو نیا نکاح کر سکتی ہے،اس مرتد کا مال اس کے مسلمان ورثاء کے درمیان تقسیم کر دیا جائے گا، اگر امام نے مرتد کے دار الحرب چلے جانے کے بعد اس کے مال کو اس کے ورثاء کے درمیان تقسیم کر دینے کا حکم دیا، اور جب یہ حکم دیا گیا تو اس کی بیوی اس کے مرتد ہونے کے دن سے تین حیض کی مدت پوری کر چکی تھی تو وہ عورت میراث نہیں پائے گی، کیونکہ اب اس کے لئے دوسرا شوہر کر لینا حلال ہو گیا ہے۔

(اسلام کا نظام محاصل .ص۵۰۳)

عورت مرتد ہو کر دار الحرب چلی جائے اور امام اس کی میراث کو اس کے ورثاء کے درمیان تقسیم کر دینے کا حکم دے دے اور عورت کا شوہر موجود ہوتو وہ وراثت میں سے حصہ نہیں پائے گا۔ یہ عورت مرتد ہوتے ہی اس مرد کے لئے حرام ہو گئی تھی، اور یہ اس کا شوہر نہیں رہ گیا تھا۔

(ایضا.ص۵۰۴)

☆☆☆☆☆

دار الاسلام

اور

جرم و سزا

دارالاسلام اور جرم وسزا

جرم وسزا

جس طرح دار الاسلام کا بیرونی دفاع ضروری ہے، اسی طرح اس کا داخلی استحکام اور امن و امان بھی ضروری ہے۔ دار الاسلام میں جرائم کی جو سزائیں بھی شریعت نے مقرر فرمائی ہیں، ان کا مقصد لوگوں کی جان، مال، عزت وآبرو کا تحفظ معاشرے کی اصلاح، اور فتنہ وفساد سے دارالاسلام کی حفاظت ہے۔

کسی ملک اور قوم میں اطمینان وسکون کی دولت فراوانی کے ساتھ اس وقت تک نہیں پائی جاسکتی جب تک ان تمام اسباب کا سرے سے قلع قمع نہ کیا جائے جو انسانی چین و اطمینان کے لئے زہر ہلاہل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور ان تمام لوگوں کا پوری قوت سے سر نہ کچل دیا جائے جو انسانی راحت و عافیت پر شب خون مارنے کے عادی مجرم ہیں۔

چنانچہ اسلام نے ان تمام اسباب ومحرکات کی سختی کے ساتھ نگرانی کی ہے جو انسانی آبادی میں شور وہنگامہ، دنگہ وفساد، اور فتنہ پروری کے مد ومعاون بنتے ہیں، اسلام سراسر رأفت ورحمت ہونے کی وجہ سے ایک لمحہ کے لئے ایسی چیزوں کو برداشت نہیں کرتا جو ملک کے امن و امان اور خرمن عافیت پر بجلی بن کر گرتی ہے۔ اور نہ ان افراد انسانی پر ترس کھاتا ہے جو قوم اور ملک کی خوشگوار زندگی سے کھیلنے کی کوشش کرتے ہیں، اس سلسلہ میں نہ وہ اپنوں کی پرواہ کرتا ہے اور نہ غیروں کی، نہ بڑوں کی، نہ چھوٹوں کی، نہ مسلم کی اور نہ ذمّی کی، نہ دار الاسلام میں بسنے والوں کی، نہ دار الحرب کے باشندوں کی۔ اس کی عدالت عالیہ میں مجرم خواہ کوئی بھی ہو اس کو پوری سزا ملتی ہے۔

(اسلام کا نظام امن، ص۱۴۸)

فقہاء کا اس پر اجماع ہے کہ دارالاسلام میں حربی مستأمن سے ان جرائم پر مواخذہ نہیں ہوگا جو اس سے دارالحرب میں واقع ہوئے ہیں۔

عبدالقادرعودہ شہید تشریع الجنائی الاسلامی میں لکھتے ہیں:

جرائم الحربی المستأمن التی یر تکبها فی دار الحرب فانه لا یعاقب علیها فی دار الاسلام ، لانه لم یلتزم احکام الاسلام الا من یوم دخوله داره۔

حربی دار الحرب میں کوئی جرم کرے تو اس پر سزا دار الاسلام میں نہیں دی جائے گی ، کیونکہ یہ حربی اسلامی احکام کا اسی وقت سے پابند ہوگا ،جس وقت سے وہ دار الاسلام میں داخل ہوا ہے۔

(التشریع الجنائی الاسلامی ج۱ص۲۸۷)

چنانچہ اگر دار الحرب میں حربی نے دار الاسلام کے مستأمن مسلمان کا قرض مار لیا ہو، یا اس کا مال غصب کر لیا ہو، پھر وہ حربی امان لے کر دار الاسلام میں آئے تب بھی اسلامی عدالت اس حربی کے خلاف اس مسلمان کی کوئی دادرسی نہ کرے گی۔

(حوالہ سود ص۴۱۵)

یہی حکم اس صورت میں ہے جب دو حربی دار الحرب میں ایک دوسرے کو قرض دیں اور دونوں مستامن بن کر دار الاسلام میں آئیں تو ان کے درمیان قرض کا فیصلہ نہیں کیا جائے گا ، کیونکہ ہمیں ان کے اوپر کوئی ولایت حاصل نہیں ، نہ قرض کے معاملے کے وقت ، اور نہ دعویٰ کے وقت ، البتہ اگر دونوں دار الاسلام میں مسلمان ہو کر آئیں تو ان کے قرض کا فیصلہ کیا جائے گا ، اس لئے کہ وقت دعویٰ ولایت حاصل ہو گئی۔

(اسلام کا فوجداری قانون ج۱ص۳۷۷)

ائمہ ثلاثہ یعنی امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ کا مسلک یہ ہے کہ دار الاسلام کی رعایا پر دار الحرب میں بھی اسلامی قانون کی پابندی لازمی ہے۔ اگر وہ وہاں کوئی جرم کریں گے تو دارالاسلام واپس آنے کے بعد ان جرائم پر ان سے مواخذہ کیا جائے گا ان کی رائے یہ ہے کہ مسلم اور ذمی کے سلسلہ میں برابر ہے کہ وہ دارالاسلام میں ارتکاب جرم کریں یا دارالحرب میں، کیونکہ جس فعل کو اسلام نے حرام قرار دیا ہے وہ ہر جگہ حرام ہے۔ اگر مملکت کی تبدیلی سے جرم کی حرمت میں کوئی فرق نہیں آتا تو اس جرم کے ارتکاب پر اس کی مقررہ سزا کیوں جاری نہیں ہوگی۔

چنانچہ مسلمان اور ذمی کو ہر اس فعل پر سزا دی جائے گی جس کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے، اور جس کا ارتکاب انہوں نے دار الحرب میں کیا ہو، خواہ دار الحرب میں یہ فعل جائز ہی کیوں نہ ہو۔ البتہ اگر صورت اس کے برعکس ہو کہ دارالحرب میں کوئی فعل حرام ہو اور اسلام میں جائز ہو تو اس کے دار الحرب میں ارتکاب کرنے پر دار الاسلام میں کوئی سزا نہیں دی جائے گی۔

(اسلام کا فوجداری قانون ج١ص٣٨٠)

لیکن امام ابوحنیفہؒ کی رائے یہ ہے کہ جن جرائم کا ارتکاب کوئی مسلمان یا ذمی دار الاسلام سے باہر کرے ان پر شریعت اسلامیہ جاری نہیں ہوگی، خواہ اس جرم کا ارتکاب کرنے والا دار الاسلام کا باشندہ ہو، اور وہ دارالحرب جا کر واپس آجائے، یا کوئی دارالحرب کا باشندہ ہو جو بعد ازاں دارالاسلام میں آ کر اقامت اختیار کرے۔

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مسئلہ کسی مسلم یا ذمی کا کسی مقام پر رہتے ہوئے احکام اسلامی کی پابندی کا نہیں ہے، بلکہ ان کے نزدیک حد کے قائم کرنے میں امام کا فرض اصل مسئلہ ہے۔ اور امام پر حد کا قائم کرنا، اور سزا کا جاری کرنا اسی وقت فرض ہے جب وہ اس کی

قدرت رکھتا ہو، کیونکہ وجوب کی شرط قدرت ہے ،اور امام کو دار الحرب میں کئے جانے والے کسی جرم پر اس کے ارتکاب کے وقت کوئی قدرت نہیں ہے ، اس لئے اس پر سزا بھی جاری کرنا واجب نہیں ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت جرم کا ارتکاب کیا جارہا ہو، اس وقت مقام جرم پر اقتدار حاصل ہو، اور مندرجہ بالا صورت میں اسلامی ریاست کو مقام جرم پر اقتدار حاصل نہیں ہے ، اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ اگر ارتکاب جرم کے بعد مقام جرم اسلامی ریاست میں شامل ہو جائے تو شریعت اسلامی اس جرم پر جاری نہیں ہو گی ، کیونکہ جس وقت جرم کا ارتکاب کیا گیا اس وقت یہ مقام اسلام کے زیر اقتدار نہیں تھا۔

(اسلام کا فوجداری قانون ج۱ص ۳۷۴)

مولانا مودودی کے نزدیک امام ابوحنیفہؒ کی رائے قابل ترجیح ہے ۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب سود میں لکھتے ہیں:

تمام فقہاء اسلام میں صرف امام ابوحنیفہؒ ہی ایسے فقیہ ہیں جنہوں نے اس نازک اور پیچیدہ قانونی مسئلہ کو ٹھیک ٹھیک سمجھایا ہے۔

(سود ص ۴۲۱)

نیز اس مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا مودودی لکھتے ہیں:

بیرونی ممالک میں جا کر دار الاسلام کی رعایا کے جو لوگ جرائم اور بد اخلاقیوں کا ارتکاب کریں ان سے دار الاسلام کی حکومت اس بات پر تو ضرور باز پرس کرسکتی ہے کہ انہوں نے اپنے رویہ سے اسلام اور مسلمانوں کی بدنامی کا سامان کیا، اور اس بنیاد پر بھی وہ ان سے مواخذہ کرسکتی ہے کہ انہوں نے اپنے غلط طرز عمل سے اپنی ریاست کے لئے بین الاقوامی معاملات میں الجھنیں پیدا کیں، لیکن ان پر نفس اس جرم (مثلاً قتل یا چوری) کے بارے

میں کوئی مقدمہ نہیں چلایا جائے گا جس کا ارتکاب انہوں نے دارالاسلام کے حدود سے باہر کیا ہو۔

(ایضاً ص ۴۰۹)

جرم قطع الطریق اور اس کی سزا

جو لوگ دارالاسلام کے اندر رہ کر یا باہر سے آکر اس میں فساد پھیلائیں، ڈاکے ڈالیں اور قتل و غارت کا بازار گرم کریں، اور حکومت اسلامی کے امن و امان میں خلل برپا کریں، یا تشدد کے ذریعہ سے نظام اسلامی کا تختہ الٹنے کی کوشش کریں، ان پر اس جرم کا اطلاق ہوتا ہے۔

(الجہاد فی الاسلام۔ ص ۵۷)

اس جرم کے سلسلہ میں بعض شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔ اوّل یہ کہ ایسا واقعہ دارالاسلام میں پیش آئے نہ کہ دارالحرب میں۔ چنانچہ اگر دارالاسلام کے رہنے والے رہزن دارالحرب میں داخل ہوکر رہزنی کریں تو دارالاسلام کا حاکم ان پر حد نہیں نافذ کرسکتا۔

(اسلامی حدود۔ ص ۲۰۹)

اسی طرح اگر رہزنوں نے مستأمن تاجروں پر دارالحرب میں قطع طریق کیا، یا دارالاسلام ہی کے کسی علاقہ میں رہزنی کی جہاں باغیوں کے لشکر کا غلبہ تھا، پھر انہیں گرفتار کر کے حاکم کے سامنے پیش کیا گیا تو حاکم ان پر حد نہیں جاری کرے گا، اس لئے کہ انہوں نے ایسے علاقہ میں ارتکاب جرم کیا جہاں حاکم اسلام کی عملداری نہیں تھی۔

(اسلامی حدود۔ ص ۲۱۵)

دوسری شرط یہ ہے کہ مستغیث (رہزنی سے متأثر ہونے والے شخص) کی جان و مال شرعاً محفوظ ہو۔ یعنی وہ مسلمان ہو، یا ذمّی بن کر دارالاسلام میں رہتا ہو۔

(اسلامی حدود۔ ص ۲۰۲)

چنانچہ اگر ایک ایسا قافلہ سفر کر رہا تھا جس میں مسلمان بھی تھے، اور وہ کافر بھی جو دارالحرب کے رہنے والے تھے، لیکن عارضی طور پر امان نامہ لے کر دارالاسلام میں مقیم تھے ایسے قافلہ پر رہزنوں نے حملہ کیا، اور مال و اسباب لوٹا، اور قتل و غارت گری بھی کی، تو رہزنوں پر حد جاری کی جائے گی۔ البتہ اگر انہوں نے مسلمانوں کو کچھ نہیں کہا، اور صرف کفار ہی کو لوٹا تو ان پر حد نہیں جاری ہوگی۔

(ایضاً،ص۲۰۷)

یہ بھی ضروری ہے کہ رہزن مستأمن نہ ہوں، کیونکہ مستأمن پر رہزنی کی حد جاری نہیں ہوتی، بلکہ اس کی تعذیر ہوگی۔

(اسلامی حدود،ص۲۰۲)

دار الاسلام میں قتل و غارت گری اور ڈاکہ زنی کے ذریعہ سے بدنظمی پیدا کرنے والوں کے لئے نہایت عبرتناک سزائیں مقرر کی گئیں ہیں، چنانچہ ان کے متعلق قرآن مجید میں یہ حکم دیا گیا ہے:

إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ ۚ ذَالِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا ۖ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ.

(سورہ مائدہ،آیت،33)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں، اور ملک میں لوٹ مار سے فساد پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں، ان کی سزا یہ ہے کہ وہ قتل کئے جائیں، یا صلیب پر چڑ ھائے

جائیں ، یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں ، یا وہ ملک سے نکال دیئے جائیں ۔

یہ امر متفق علیہ ہے کہ قرآن مجید میں یہ عبرتناک سزائیں جو تجویز کی گئیں ہیں یہ انہی لوگوں کے لئے ہیں جو دار الاسلام کے امن میں لوٹ مار، قتل و غارت سے خلل بر پا کریں، اور سزاؤں کے مختلف مدارج ،نوعیت جرم کے مختلف مدارج سے تعلق رکھتے ہیں ۔

(الجہاد فی الاسلام ،ص۷۷)

چنانچہ اگر ان لوگوں نے دار الاسلام کے کسی مسلم یا غیر مسلم شہری کو قتل کیا ہے مگر مال نہیں لوٹا، تو ان کی سزا " أَن يُقَتَّلُوٓا " ہے ۔یعنی ان سب کو قتل کر دیا جائے ،اگر چہ فعل قتل بلاواسطہ صرف بعض افراد سے صادر ہوا ہو۔اور اگر کسی کو قتل بھی کیا، مال بھی لوٹا، تو ان کی سزا " أَوۡ يُصَلَّبُوٓا " ہے یعنی ان کو سولی پر چڑھایا جائے ،جس کی صورت یہ ہے کہ ان کو زندہ سولی پر لٹکا یا جائے ، پھر نیزہ وغیرہ سے پیٹ چاک کیا جائے ۔

اور اگر ان لوگوں نے صرف مال لوٹا ہے، کسی کو قتل نہیں کیا تو ان کی سزا " أَوۡ تُقَطَّعَ أَيۡدِيهِمۡ وَأَرۡجُلُهُم مِّنۡ خِلَٰفٍ " ہے ۔یعنی ان کے داہنے ہاتھ گٹوں پر سے اور بائیں پاؤں ٹخنوں پر سے کاٹ دیئے جائیں ۔اور اس میں بھی یہ مال لوٹنے کا عمل بلاواسطہ اگر چہ بعض سے صادر ہوا ہو مگر سزا سب کے لئے یہی ہوگی ، کیونکہ کرنے والوں نے جو کچھ کیا ہے، اپنے ساتھیوں کے تعاون اور امداد کے بھروسے پر کیا ہے، سب شریک جرم ہیں ۔

اور اگر ابھی تک قتل و غارت گری کا کوئی جرم ان سے صادر نہیں ہوا تھا کہ پہلے ہی گرفتار کر لئے گئے تو ان کی سزا " أَوۡ يُنفَوۡاْ مِنَ ٱلۡأَرۡضِ " ہے ۔یعنی ان کو زمین سے نکال دیا جائے ۔ زمین سے نکالنے کا مفہوم ایک جماعت فقہاء کے نزدیک یہ ہے کہ ان کو دار الاسلام سے نکال دیا جائے ۔ اور بعض کے نزدیک یہ ہے کہ جس مقام پر ڈاکہ ڈالا ہے وہاں سے

نکال دیا جائے۔

حضرت فاروق اعظمؓ نے اس قسم کے معاملات میں یہ فیصلہ فرمایا کہ اگر مجرم کو یہاں سے نکال کر دوسرے شہروں میں آزاد چھوڑ دیا جائے تو وہاں کے لوگوں کو ستائے گا، اس لئے ایسے مجرم کو قید خانہ میں بند کر دیا جائے، یہی اس کا زمین سے نکالنا ہے کہ زمین میں کہیں چل پھر نہیں سکتا امام اعظم ابوحنیفہؒ نے بھی یہی اختیار فرمایا ہے۔

(معارف القرآن.مولانا مفتی محمد شفیعؒ.ج۳.ص۱۲۹)

فقہائے حنفیہ کہتے ہیں کہ جلاوطنی کی صورت میں مجرم یا تو کسی دوسرے اسلامی شہر میں چلا جائے گا تو وہاں جا کر فتنہ و فساد کا باعث بنے گا، یا اگر دار الحرب چلا گیا تو وہاں دشمنان اسلام کی تقویت کا سبب بن جائے گا اس لئے یہاں مراد حبس اور قید ہی ہے۔

(تفسیر ماجدی .ص۲۵۱)

یہی تأویل زیادہ قابل ترجیح ہے کیونکہ جلا وطنی ایسی ہونی چاہئے کہ فسادی اپنی سزا بھی پالے، اور دوسرے لوگ اس کی اذیت رسانی سے محفوظ بھی ہو جائیں۔

اگر ایک شہر سے دوسرے شہر میں جلا وطن کر دیا گیا تو کچھ دنوں ممکن ہے اجنبیت کی وجہ سے ہاتھ پیر نہ مارے، لیکن کچھ دنوں بعد پھر پوری ڈھٹائی سے وہ شخص شب خون مارنا شروع کر دے گا، تو یہ کوئی سزا نہیں ہوئی۔اس لئے کہ نہ پبلک اس کی اذیت کوشیوں سے محفوظ ہوئی، اور نہ اس پر پابندی عائد ہوئی۔

دوسری صورت یہ ہوسکتی تھی کہ حدود دار الاسلام سے خارج کر دیا جائے، لیکن یہ اس لئے نہیں کیا جا سکتا کہ وہ پھر دار الحرب کا رُخ کرے گا اور کافروں کے ملک میں ایسے شخص کے متعلق اس کے سوا اور کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ دین اسلام سے پھر جائے اور غیر مذہب قبول کرے، تو گویا ارتداد کا موقع دینا ہوا، اس لئے یہ بھی درست نہیں ہے۔

چونکہ یہ جرم اس کا پہلا ہے، اس لئے قتل بھی جائز نہیں ہے، لہٰذا جلا وطنی کے معنیٰ یہاں یہی لئے جا سکتے ہیں کہ اس کو محبوس کر دیا جائے کہ عوام سے اس کا رشتہ باقی نہ رہے، اور پوری آبادی سے جلا وطنی کی زندگی گزارے۔ محققین علماء کی یہی رائے ہے، اور جلاوطنی کے یہی معنیٰ درست بھی ہوتے ہیں۔ رہا قید کس شہر کی جیل میں کی جائے یہ حاکم کی رائے پر ہے، جہاں مناسب سمجھے کرے۔

(اسلام کا نظام امن ،ص،۲۹۷)

اس آیت میں " یُحَارِبُونَ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ " کے الفاظ سے جہلا کو یہ دھوکہ ہوا ہے کہ اس سے مراد وہ کفار ہیں جن سے مسلمانوں کی باقاعدہ لڑائی ہو، لیکن در اصل خدا اور رسول کے ساتھ محاربہ کرنے سے مراد سعی فساد فی الارض ہے۔

اسلامی فقہ میں اس سے مراد دو قسم کے جرائم لئے گئے ہیں، ایک وہ جن سے مقصود دار الاسلام میں قتل و غارت گری اور ڈاکہ زنی کے ذریعہ سے بد نظمی پیدا کرنا ہو۔ دوسری وہ جن سے مقصود اسلامی نظام کو بزورمٹا کر کوئی غیر اسلامی نظام قائم کرنا ہو۔

(الجہاد فی الاسلام ،ص،۵۷)

دار الاسلام کے برحق قانونی سربراہ کے خلاف اگر کوئی فرد یا گروہ خروج کرے یا شورش برپا کرے تو اطاعت کی دعوت دی جائے گی، اور انکار کی صورت میں ان سے قتال (جنگ) واجب ہے، جس میں شریک ہونا جہاد فی سبیل اللہ کی طرح ہر مسلمان پر فرض ہے۔ برحق امام وقت کے خلاف بغاوت وخروج کرنے والے تین قسم کے لوگ ہو سکتے ہیں، یعنی قطاع الطریق، باغی اور خوارج۔

(اردو دائرہ معارف الاسلامیہ ،ج۹،ص۱۰۲)

دارالحرب میں دارالحرب کے مسلمان کا قتل

اسلام قبول کرنے کی پہلی برکت یہ ہے کہ اس کی حلقہ بگوشی کے بعد ہی جان و مال دونوں کی عصمت فوراً نصیب ہو جاتی ہے۔فقہاء کے نزدیک اس عصمت کی دو قسمیں ہیں عصمت مؤثمہ اور عصمت مقومہ۔

جس کے ازالہ سے صرف گناہ ہو اس کو عصمت مؤثمہ کہتے ہیں۔اور جس کے ازالہ سے دیت لازم ہو اس کا نام عصمت مقومہ ہے۔پہلی عصمت اسلام قبول کرنے سے حاصل ہوتی ہے،اور دوسری دارالاسلام کی سکونت سے۔اس لحاظ سے اگر ایک مسلمان دارالحرب میں رہتا ہے،تو اس کو عصمت مؤثمہ تو حاصل ہے مگر عصمت مقومہ حاصل نہیں۔

پس اگر کوئی مسلمان دارالحرب میں قتل کر دیا جائے تو اس کے قاتل کو صرف گناہ ہوگا،مگر اس پر دیت لازم نہ آئے گی۔پوری پوری عصمت اس وقت حاصل ہوگی جبکہ اسلام لانے کے ساتھ سکونت بھی دارالاسلام کی اختیار کر لی جائے۔

(ترجمان السنۃ،ج۲،ص۱۵۲)

اس لئے اگر کوئی مسلمان ہجرت کر کے دارالاسلام میں نہ آجائے بلکہ کسی وجہ سے دارالحرب ہی میں رہتا ہو اور اسے کوئی مسلمان قتل کر دے تو قاتل پر صرف کفارہ ہے یعنی ایک مسلمان غلام آزاد کرنا،یا دو ماہ کے مسلسل روزے رکھنا،اس پر دیت واجب نہیں۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ قیاس کا مقتضیٰ بھی یہی ہے کہ صورت مذکورہ میں فقط کفارہ واجب ہو،اور دیت واجب نہ ہو،اس لئے کہ اگر دارالحرب میں رہنے والے مسلمان کے قتل میں دیت واجب کی جاتی تو جو لوگ دارالحرب میں غزوہ کرنے جاتے تو اس بات پر مجبور ہوتے کہ غزوہ کرنے سے پہلے اس امر کی تحقیق کریں کہ کون مسلمان ہے اور کون کافر اور مشرک ہے،اور یہ امر نہایت دشوار ہے،مجاہدین کو سخت تنگی اور ضیق میں ڈالنے والا ہے۔

لہٰذا حق تعالیٰ نے دارالحرب میں رہنے والے مسلمان کے قتل میں دیت واجب

نہیں کی تاکہ لوگ احتیاط کے خیال سے جہاد اور غزوہ سے پرہیز نہ کرنے لگیں۔ البتہ بحق اسلام اس پر کفارہ واجب کردیا۔ یہ کفارہ اللہ تعالیٰ کا حق ہے کہ تم نے اس کے ایک مسلمان بندہ کو مار ڈالا۔

(تفسیر معارف القرآن ,مولانا محمد ادریس کاندھلوی ,ج۲,ص۱۳۷)

نیز دیت اس لئے بھی نہیں کہ اگر اس مقتول کے ورثا مسلمان ہیں تو وہ تحت ولایت حاکم علم نہ ہونے کے باعث مستحق نہیں، اور اگر کافر ہیں تو اس صورت میں دیت بیت المال کا حق ہوتی، اور دارالحرب سے بیت المال میں ترکہ لایا نہیں جاتا۔

(تفسیر بیان القرآن,ج۲,ص۱۴۵)

دارالحرب میں دارالاسلام کے مسلمان کا قتل

دارالاسلام کی رعایا میں سے دو مسلمان امان لے کر دارالحرب میں چلے گئے اور وہاں ایک نے دوسرے کو قتل کردیا۔ اگر قاتل دارالاسلام میں واپس آئے تو اس سے قصاص نہ لیا جائے گا۔ اگر عمداً قتل کیا ہو تو اس کے مال سے خون بہا واجب ہوگا، اور اگر خطا سے مارا ہو تو کفارہ بھی لازم آئے گا۔ یہ امام ابوحنیفہ کی رائے ہے۔

(سود,ص۴۱۵)

لیکن امام ابو یوسف، امام محمد، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل بالاتفاق فرماتے ہیں کہ اگر دارالکفر میں اسلامی رعایا کا ایک فرد دوسرے کو قتل کردے تو قاتل سے قصاص لیا جائے گا کیونکہ اس نے ایک ایسے شخص کو قتل کیا جو معصوم بالاسلام تھا۔ مولانا مودودی کے نزدیک امام ابوحنیفہؒ کی رائے قابل ترجیح ہے۔

(ایضا,ص۴۲۱)

دارالاسلام کی رعایا میں سے دو مسلمان دارالحرب میں قید تھے ان میں سے ایک نے دوسرے کو قتل کردیا، یا کوئی مسلمان امان لے کر دارالحرب گیا، اور وہاں اس نے کسی

مسلمان کوقتل کر دیا، دونوں صورتوں میں قاتل پر نہ قصاص ہے نہ خون بہا۔

(ایضاً،ص۴۱۶)

معاہد، مستأمن اور ذمّی کا قتل

اگر مقتول کسی ایسے دار الکفر کا باشندہ ہو جس سے اسلامی حکومت کا معاہدہ ہے تو قاتل کو ایک غلام آزاد کرنا ہوگا ۔ اور اس کے علاوہ خون بہا بھی دینا ہوگا ،لیکن خون بہا کی مقدار وہی ہوگی جتنی اس معاہد قوم کے کسی غیر مسلم فرد کوقتل کر دینے کی صورت میں از روئے معاہدہ دی جانی چاہیئے ۔

(تفہیم القرآن،ج۱،ص۳۸۳)

اگر اسلامی رعایا کا کوئی فرد خواہ وہ مسلمان ہو یا ذمی کسی مستأمن کوقتل کر دے تو قاتل سے قصاص نہ لیا جائے گا، محض دیت وصول کی جائے گی ،اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اسلامی رعیت نہیں ہے، اور اجنبی کو اپنی رعیت کے برابر حقوق کوئی حکومت بھی نہیں دیا کرتی ۔ فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے:

ولا يقتل المسلم والذمی بحربی دخل دارنا بامان۔

(فتاوی عالمگیریہ،کتاب الجنایات،ج۴،ص۲)

اگر کسی مسلمان نے ذمّی کوقتل کر دیا تو اس کے بدلے میں مسلمان کوقتل کیا جائے گا۔ فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے:

ويقتل المسلم بالذمی۔

(ایضاً)

دار الاسلام کا مثالی دور

دار الاسلام کا مثالی دور

رسول اللہ ﷺ کا اعلیٰ اور مقدس نصب العین یہ تھا کہ اللہ کی زمین پر اللہ کی حکومت قائم فرمائیں، اور اس کے نائب کی حیثیت سے اس کا آخری ابدی، اکمل اور عالمگیر قانون نافذ کریں۔ لیکن مکہ میں جہاں کفار کا غلبہ تھا ایسا موقعہ کہاں میسر تھا۔ آزاد حکومت قائم کرنے کے لئے ایک آزاد مرکز و مستقر کی ضرورت تھی۔

اگر خداوند قدیر چاہتا تو انہی مٹھی بھر مظلوم و مجبور مسلمانوں کو ان سب پر غالب کر دیتا، اور ان کے دشمنوں کو دفعتاً کچل کر تباہ کر ڈالتا، مگر حکمت الٰہیہ کا تقاضہ یہ تھا کہ امت ہر قدم پر اس عالم اسباب کے محکم نظام کے ماتحت اپنے نبی سے سبق حاصل کریں اور زندگی کے ہر ایک روشن یا تاریک دور میں اپنے مستقبل کی تعمیر کا کام سیکھیں۔ اس لئے اس ناسازگار فضا میں سیاست اور حکمت کا ایک نیا باب کھولا گیا۔

یعنی یہ کہ اسلام کے لئے مکّہ سے ہٹ کر (جو اس وقت دار الحرب تھا) کوئی ایسا مامن و مسکن بناؤ جو اگرچہ ابتداً مکمل طور پر دار الاسلام نہ کہلایا جا سکے، تاہم اسلام وہاں آزاد ہو اور کم از کم اپنے پیروؤں پر اپنا قانون بے روک ٹوک نافذ کر سکیں۔

پھر جب تائید ربّانی سے مسلمانوں کا وہ آزاد مرکز دائرہ اسباب میں مضبوط اور طاقتور ہو جائے (خواہ وہ کتنا ہی محدود پیمانہ پر ہو) تو اس مرکز سے اسلام کو اپنے اصلی عزائم کے فروغ اور وسعت دینے کا موقعہ مل سکے۔ اسی نکتۂ نگاہ سے یثرب کو مرکز توجہ بنایا گیا۔

(خطبات عثمانی. ص۱۲)

مکّی دور کے آخری تین چار سالوں سے یثرب میں آفتاب اسلام کی شعاعیں مسلسل پہنچ رہی تھیں، اور وہاں کے لوگ متعدد وجوہ سے عرب کے دوسرے قبیلوں کی بنسبت زیادہ

آسانی کے ساتھ اس روشنی کو قبول کرتے جا رہے تھے۔آخر کار نبوت کے بارہویں سال حج کے موقعہ پر پچھتر (۷۵) نفوس کا ایک وفد نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے رات کی تاریکی میں ملا، اور اس نے نہ صرف یہ کہ اسلام قبول کیا بلکہ آپ کو اور آپ کے پیروؤں کو اپنے شہر میں جگہ دینے پر بھی آمادگی ظاہر کی۔

یہ اسلام کی تاریخ میں ایک انقلابی موقعہ تھا جسے خدا نے اپنی عنایت سے فراہم کیا، اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہاتھ بڑھا کر پکڑ لیا۔اہل یثرب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک پناہ گزین کی حیثیت سے نہیں بلکہ خدا کے نائب اور اپنے امام وفرمانروا کی حیثیت سے بلا رہے تھے،اور اسلام کے پیروؤں کو ان کا بلاوا اس لئے نہ تھا کہ وہ ایک اجنبی سرزمین میں محض مہاجر ہونے کی حیثیت سے جگہ پالیں گے، بلکہ مقصد یہ تھا کہ عرب کے مختلف قبائل اور خطوں میں جو مسلمان منتشر ہیں وہ یثرب میں جمع ہوکر اور یثربی مسلمانوں کے ساتھ مل کر ایک منظّم معاشرہ بنالیں، اس طرح یثرب نے دراصل اپنے آپ کو مدینۃ الاسلام کی حیثیت سے پیش کیا، اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے قبول کر کے عرب میں پہلا دارالاسلام بنالیا۔

(تفہیم القرآن،ج۲،ص۱۱۹)

جب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرمائی، اور ایک چھوٹا ساخطّہ عرب کی سرزمین میں ایسا بہم پہنچ گیا جہاں ایک مؤمن کے لئے اپنے دین وایمان کے تقاضوں کو پورا کرناممکن تھا،تو عام حکم دیا گیا کہ جہاں جہاں،جس جس علاقے اور جس جس قبیلے میں اہل ایمان کفار سے دبّے ہوئے ہیں اور اسلامی زندگی بسر کرنے کی آزادی نہیں رکھتے وہاں سے ہجرت کریں اور مدینہ کے دارالاسلام میں آجائیں۔

اس وقت جولوگ ہجرت کی قدرت رکھتے تھے اور پھر صرف اس لئے اٹھ کر نہ آئے کہ انہیں اپنے گھر بار،اعزّا واقارب، اور اپنے مفادات اسلام کے بنسبت عزیز تر تھے، وہ

سب منافق قرار دے دیئے گئے۔اور جولوگ درحقیقت میں بالکل مجبور تھے ان کو مستضعفین میں شمار کیا گیا۔

(تفہیم القرآن ج۱،ص۳۷۹)

جب تک آنحضرت ﷺ مکّہ میں تھے حکم تھا کہ کفار کی سختیوں پر مسلمان صبر کریں، اور ہاتھ روکے رکھیں، چنانچہ انہوں نے کامل تیرہ (13) سال تک سخت ترین مظالم کے مقابلے میں بے مثال صبر و استقامت کا مظاہرہ کیا۔

جب مدینہ دار الاسلام بن گیا اور مسلمانوں کی قلیل سی جمعیت ایک مستقل مرکز پر جمع ہوگئی تو مظلوم مسلمانوں کو جن سے کفار برابر لڑتے رہتے تھے اجازت ہوئی، بلکہ حکم ہوا ظالموں کے مقابلے پر تلوار اٹھائیں، اور اپنی جماعت اور مذہب کی حفاظت کریں۔

(تفسیر عثمانی ص۵۸۱)

مدینہ کے دار الاسلام بن جانے کے بعد تمام مخلص مسلمانوں سے یہ توقع کی جاتی تھی بلکہ ان پہ یہ فرض عائد ہوتا تھا کہ اوّل تو وہ اپنی سکونت ترک کریں، اور ہجرت کر کے مدینہ آجائیں۔اور دوم حضور ﷺ کے ساتھ مل کر دشمنوں سے جہاد کریں۔

چنانچہ ابوداؤد کی کتاب الجہاد میں ہے کہ جب حضور ﷺ کسی کو لشکر کا سردار مقرر کر کے بھیجتے تو اس کو منجملہ دوسری ہدایات کے ایک یہ ہدایت بھی فرماتے تھے:

"ان کو پہلے اسلام کی طرف دعوت دینا، اگر وہ قبول کرلیں تو ان سے ہاتھ روک لینا پھر ان سے کہنا کہ اپنے دار کو چھوڑ کر مہاجر بن کے داریعنی دار الاسلام میں آجائیں۔

اور انہیں بتا دینا کہ اگر انہوں نے ایسا کیا تو ان کے وہی حقوق ہوں گے جو مہاجرین کے ہیں، اور وہی واجبات ان پر عائد ہوں گے جو مہاجرین پر ہیں۔

اگر وہ انکار کریں اور اپنے ہی دار میں رہنا اختیار کریں تو انہیں آگاہ کر دینا کہ ان

کی حیثیت اعراب مسلمین کی سی ہو گی۔ ان پر اللہ کے وہ تمام احکام جاری ہوں گے جو مؤمنین پر جاری ہوتے ہیں ، مگر فَے اور غنیمت میں ان کا کوئی حصّہ نہ ہو گا الا یہ کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر جہاد کریں"۔یعنی مسلمانوں کے لئے مستقل طور پر یا جہاد کے لئے عارضی طور پر مدینہ آنا ضروری تھا۔

مسلمانوں اور مکّہ کے مشرکوں کے درمیان حق و باطل کا پہلا باقاعدہ معرکہ میدان بدر میں ہوا۔ بدر کا معرکہ فی الحقیقت اسلام کی عالمگیر اور طاقتور برادری کا سنگ بنیاد اور حکومت الٰہیہ کی تاسیس کا دیباچہ تھا۔

اس کے بعد بھی کئی بار کفار سے معرکہ آرائی ہوئی ،اس کی دوصورتیں تھیں یا تو دشمنوں نے دارالاسلام پر حملہ کیا،اوران کا مقابلہ کیا گیا، یا یہ معلوم ہوا کہ دشمن مدینہ پر حملہ کی تیاری کر رہا ہے تو پیش قدمی کی گئی ۔

حضور ﷺ کی حکمت عملی یہ تھی کہ پہلے تو تمام عرب کے مسلمان ترک وطن کر کے مدینہ آجائیں ، اور مرکز اسلام کو مضبوط کریں ، اور پھر اپنی مجاہدانہ قربانیوں سے کفر کی قوت کو توڑ کر جزیرۃ العرب کی سطح ایسی ہموار کر دیں کہ کسی مسلمان کو ہجرت کی ضرورت ہی باقی نہ رہے، یعنی سارا جزیرۃ العرب دارالاسلام بن جائے ۔

چنانچہ حضور ﷺ کی اسی حکمت عملی اور تائید ایزدی سے بالآخر سن آٹھ ہجری میں مکّہ فتح ہو گیا اور وہ دارالاسلام بن گیا۔اس موقعہ پر آپ ﷺ نے فرمایا:

لا ھجرۃ بعد الفتح۔

یعنی جب مکّہ فتح ہو کر دارالاسلام بن گیا ہے تو اب یہاں سے ہجرت فرض نہیں رہی ۔

فتح مکّہ کے بعد مسلمانوں اور جاہلیت پرست قبائل کا آخری معرکہ حنین کے میدان میں پڑا ، اور حنین میں کفار کی شکست کے ساتھ ہی عرب کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا کہ اُسے اب

دار الاسلام بن کر رہنا ہے ۔ اس واقعہ کے ایک سال کے اندر اندر عرب کا بیشتر حصّہ اسلام کے دائرے میں داخل ہو گیا۔

خلفائے راشدین کے دور میں اسلامی فتوحات کا سیلاب عرب کی سرزمین سے اٹھا اور اس نے فلسطین سے گزر کر بحیرۂ روم تک رومی سلطنت کو پامال کیا۔ اور ایران جیسی عظیم الشان طاقت کو شکست دی ۔

دوسری طرف مصر جیسا زرخیز علاقہ اور آباد سرزمین کافروں کے تسلط سے نکال کر انہوں نے اسے دار الاسلام بنایا اور وہیں سے افریقہ کے اور حصّوں پر چڑھائیاں ہوتی رہیں۔

خلافت راشدہ حقیقت میں محض ایک سیاسی حکومت نہ تھی بلکہ نبوت کی مکمل نیابت تھی ، یعنی اس کا کام صرف اتنا ہی نہ تھا کہ ملک کا نظم ونسق چلائیں ، امن قائم کریں ، اور سرحدوں کی حفاظت کرتے رہیں، بلکہ وہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں معلّم ،مربی اور مرشد کے وہ تمام فرائض انجام دیتی تھی جو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی حیات طیبہ میں انجام دیا کرتے تھے۔ اوراس کی یہ ذمّہ داری تھی کہ دارالاسلام میں دین حق کے پورے نظام کو اس کی اصلی شکل اور روح کے ساتھ چلائیں ، اور دنیا میں مسلمانوں کی پوری اجتماعی طاقت اللہ کا کلمہ بلند کرنے کی خدمت پر لگا دیں۔

(خلافت و ملوکئیت.ص.۱۰۵)

اسلام کی اصل سادگی حضرت عثمانؓ کے شروع زمانے تک قائم رہی ،لیکن جب فتوحات کی کثرت اوراموال غنیمت کی فراوانی کے باعث مسلمانوں کو بیت المال سے بہت بڑی رقمیں بطور وظیفہ ملنے لگیں ، اورتجارت وزراعت کی ترقی نے دارالاسلام کو فارغ البالی کا گہوارہ بنا دیا تو ایرانی اور رومی تمدّن کے تکلفات اسلامی سادگی کی جگہ لینے لگے۔

پہلی صدی ہجری میں اسلام انتہائی تیزی اور بڑی کامیابی کے ساتھ پھیلا ، اور اسلامی حکومت کی حدیں دنیا کے بڑے حصّے میں پھیل گئیں ،اور دنیا شریعت کے مطابق دو حصوں میں منقسم تھی۔

ایک دارالاسلام جہاں اسلامی قوانین وضوابط نافذ تھے،اور دوسرا دارالحرب جہاں غیراسلامی قوانین کے مطابق نظم ونسق چلتا تھا۔

گوسقوط بغداد سے پہلے ہی دارالاسلام کے مختلف خطّوں میں ایک سے زائد امام حکومت کرتے رہے،لیکن سقوط بغداد نے دارالاسلام کی حیثیت میں نمایاں تغیر پیدا کردیا۔

اس وقت سے دارالاسلام کی وحدت اور یکجہتی کا نشان ناپید ہوگیا،اور چھوٹی چھوٹی حکومتوں کی بہت بڑی تعداد وجود میں آگئی۔اوران کے حکمرانوں کے درمیان حصول اقتدار کے لئے شدید کشمکش جاری رہی۔

بالآخر دارالاسلام تین بڑے حصوں میں منقسم ہوگیا۔ایک عثمانی سلطنت جو یورپی مقبوضات کے علاوہ مغربی ایشیاء پر مسلط تھی ، دوسری صفوی سلطنت جس کے قبضے میں ایران تھا،تیسری مغلیہ سلطنت جووسط ایشیاءاور ہندوستان پر مشتمل تھی۔

❁❁❁❁❁

دار الاسلام
اور
برصغیر

دارالاسلام اور برصغیر

انیسویں صدی مسیحی کے آغاز میں انگریزوں نے ہندوستان کی اسلامی سلطنت کی آخری آماجگاہ دلّی پر قبضہ جمالیا، اسی وقت سے علماء میں ایک بحث یہ شروع ہوگئی کہ ہندوستان دار الاسلام ہے یا دار الحرب؟ یعنی انگریز کے دور اقتدار میں برّصغیر ہند کی شرعی حیثیت کیا ہے۔ یہی وہ بنیادی مسئلہ ہے جس کی بنا پر بعد میں تحریک آزادئی ہند میں مسلمان جماعتوں اور ان کے رہنماؤں کا کردار مختلف رہا ہے۔

اس دور کے نہایت بلند پایہ عالم دین شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ (متوفی ۱۸۲۴ء) نے ہندوستان کے دار الحرب بن جانے کا فتویٰ صادر کر دیا۔ آپ نے اس کے اسباب وعلل بھی بتائے جن میں اہم ترین حصہ یہ تھا کہ انگریز نے ہمارے دین میں مداخلت کی ہے، اورقرآنی قانون کے خلاف اپنا قانون ہم پر نافذ کیا ہے۔

شاہ صاحب نے فرمایا کہ جہاں امام المسلمین کا حکم جاری نہ ہو، بلکہ کفّار کا حکم چل رہا ہو وہاں بعض احکام اسلام سے تعرض نہ ہونا لا حاصل ہے۔ محض جمعہ وعیدین، یا آذان و ذبح بقر کی آزادی ایسی سرزمین کو دار الاسلام نہیں بنا سکتی۔ فتاویٰ عزیزیہ میں شاہ صاحب کے اس فتویٰ کا ذکر موجود ہے۔

(فتاوي عزيزيه ،ص۵۴۸)

اس وقت کے بیشتر علمائے حق نے اس فتویٰ پر صاد کیا، اور اس فتویٰ کی بازگشت بنگال سے لے کر سندھ تک پورے ہندوستان میں پہنچی۔ اور علماء نے استخلاص وطن کے لئے عملی تدبیروں پر سوچنا شروع کر دیا۔

حاجی شریعت اللہ کی فرائضی تحریک اور سید احمد شہید کی تحریک مجاہدین اس فتویٰ کا

عملی مظہر رہیں۔حاجی شریعت اللہ نے بنگال کی سرزمین پر دارالحرب کے فتویٰ کی روشنی میں انگریزی اقتدار کوچیلنج کیا اور اعلان کیا کہ ہندوستان چونکہ دارالحرب ہے، یہاں مسلمانوں کی حکومت نہیں ہے، بلکہ ایک ایسی حکومت قائم ہے جو یہاں کے لوگوں پر شدید ظلم کر رہی ہے، اس لئے ایسے ملک میں مسلمانوں کے لئے عیدین اور جمعہ پڑھنا جائز نہیں تاوقتیکہ وہ عملاً اس کو دارالاسلام میں نہ تبدیل کرلیں۔

اسی طرح سید احمد شہید بھی فتویٰ دارالحرب کی روشنی میں یہ سمجھتے تھے کہ انگریزوں کے برسراقتدار آجانے سے یہ ملک دارالاسلام نہیں رہا، اس لئے انہوں نے اپنا فرض سمجھ لیا کہ وہ کسی آزاد علاقہ میں جو انگریزوں کے احاطۂ اقتدار سے باہر ہو ہجرت کر جائیں، اور وہاں سے جہاد شروع کرلیں۔

جماعت مجاہدین کا مقصد اصلی ہندوستان کو پھر سے دارالاسلام بنانا تھا،شاہ صاحب اپنی جماعت کے ساتھ شمال مغربی سرحدی علاقہ میں ہجرت کر کے گئے۔وہاں عملاً اسلامی حکومت قائم کی مگر وہاں کے خوانین کی غدّاری کے نتیجے میں بالاکوٹ کی سرزمین کو اپنے خون سے رنگین کر کے حیات جاودانی حاصل کر گئے۔

انگریز کے دور حکومت میں جہاد اور ہجرت مسلمانوں کے اہم موضوع تھے،اور انگریز نے بھی پورے طور پر کوشش کی کہ کسی طرح مسلمانوں کی توجہ ان مسائل سے ہٹائی جائے، اس کے لئے اس نے جہاں علمی اور تعلیمی ادارے قائم کئے وہیں مسلمانوں کے اندر جماعتی اور انفرادی کوششوں سے اس امر کی پوری اشاعت کردی کہ ہندوستان دارالحرب نہیں ہے،اور انگریز سے جہاد اور ہندوستان سے ہجرت ضروری نہیں ہے۔

مرزا غلام احمد قادیانی نے دارالحرب اور جہاد کا خوب رد کیا،اور ایسے مسلمانوں کی فہرستیں بنا بنا کر حکومت کو بھیجیں جو ہندوستان کو دارالحرب سمجھتے تھے۔

بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوستان کے دارالحرب ہونے میں علماء کا اختلاف رہا ہے۔ جو علماء ہندوستان کو دارالحرب نہیں سمجھتے تھے ضروری نہیں کہ وہ انگریز کے ایماء پر ہی ایسا کرتے رہے، بلکہ اپنی تحقیق اور نیک نیّتی کی بنا پر بھی وہ ایسا سمجھ سکتے تھے۔

جیسا کہ مولانا احمد رضا خان بریلوی اور مولانا اشرف علی تھانویؒ کے فتوؤں سے ظاہر ہے جو اس زمانے میں بھی شائع ہوئے تھے۔ اور اب حال ہی میں "دو اہم فتوے" کے عنوان سے انہیں یکجا بھی شائع کیا گیا ہے۔

ان دو حضرات کے علاوہ بھی بعض علماء ہندوستان کو دارالحرب نہیں سمجھتے تھے، بعض علماء کی تحقیق یہ تھی کہ ہندوستان نہ دارالحرب ہے نہ دارالاسلام بلکہ دارالامن ہے۔

بہر حال جو لوگ ہندوستان کو دارالحرب سمجھتے تھے ان میں سے بعض تو ہندوستان سے ہجرت کر کے حجاز چلے گئے جیسا کہ شاہ عبدالعزیز کے نواسے شاہ محمد اسحاق 1841ء میں ہندوستان سے مکّہ معظّمہ ہجرت کر گئے، اور بعض نے ہندوستان ہی میں رہ کر انگریزوں کے خلاف جدو جہد کی۔

1857ء کی جنگ آزادی میں بھی علماء نے بھر پور کردار ادا کیا۔ ریشمی رومال کی تحریک اور تحریک خلافت بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھی۔ تحریک خلافت کے بعد جب انگریز سے ملک کو آزاد کرانے کی جدو جہد زور پکڑ گئی تو اس وقت ایک نیا مسئلہ یہ پیدا ہو گیا کہ انگریز کے جانے کے بعد ہندوستان کی پوزیشن کیا ہوگی؟ اور اس میں مسلمانوں کی حیثیت کیا ہوگی؟

کانگرس کے ہمنوا علماء کا موقف یہ تھا کہ ہندوستان متحد رہے، اور اس میں ہندو اور مسلمان مل جل کر حکومت کا نظام چلائیں، جب کہ مسلم لیگ اور اس کے حامی علماء کا نظریہ یہ تھا کہ ہندو اور مسلمانوں کا اکھٹا رہنا ممکن نہیں ہے، اس لئے جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے ان علاقوں پر مشتمل مسلمانوں کی ایک الگ ریاست قائم ہونی چاہئے۔

یہ نظریہ سب سے پہلے علامہ اقبال نے 1930ء میں پیش کیا تھا، اور بعد میں مسلم لیگ نے قائد اعظم کی قیادت میں اس کو اپنا نصب العین بنا لیا۔ درحقیقت علامہ اقبال کا نصب العین دارالاسلام کا قیام تھا، اس کے متعلق مولانا مودودی کی شہادت دی جا سکتی ہے۔ مولانا مودودی کی وہ تحریر جو 1938ء میں جامعہ ملیّہ دہلی کے سٹوڈنس میگزین "جوہر" کے اقبال نمبر میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں مولانا مودودی لکھتے ہیں:

"سیاسیات میں ان کا نصب العین محض کامل آزادی ہی نہ تھا بلکہ وہ آزاد ہندوستان میں دارالاسلام کو اپنا مقصود حقیقی بنائے ہوئے تھے، اس لئے کسی ایسی تحریک کا ساتھ دینے پر آمادہ نہ تھے جو ایک دارلکفر کو دوسرے دارالکفر میں تبدیل کرنے والی ہو۔

صرف یہی وجہ ہے کہ انہوں نے عملی سیاسیات میں ان لوگوں کے ساتھ مجبورانہ تعاون کیا جو برٹش گورنمنٹ کے زیر سایہ ہندو راج کے قیام کی مخالفت کر رہے تھے۔ گو مقاصد کے اعتبار سے ان میں اور اس طبقہ میں کوئی ربط نہ تھا، مگر صرف مصلحت نے ان کو اس طبقہ کے ساتھ جوڑ رکھا تھا کہ جب تک مسلمان نوجوانوں میں دارالاسلام کا نصب العین ایک آتش فروزاں کی طرح بھڑک نہ اٹھے، اور وہ اس کے لئے سرفروشانہ جدوجہد پر آمادہ نہ ہوں اس وقت تک کم از کم انقلاب کے رُخ کو بالکل دوسری جانب پلٹ جانے سے روکے رکھا جائے۔

اس بنا پر انہوں نے ایک طرف اپنی شاعری سے نوجوانانِ اسلام کے دلوں میں وہ روح پھونکنے کی کوشش کی جس سے سب لوگ واقف ہیں، اور دوسری طرف عملی سیاسیات میں وہ روش اختیار کی جس کے اصل مقصود سے چند خاص آدمیوں کے سوا کوئی واقف نہیں۔ اور جس کے بعض ظاہری پہلوؤں کی وجہ سے وہ خود اپنے بہترین عقیدت مند معترفین تک کے طعنے سنتے رہے"۔

(اقبال اور مودودی۔ص۳۷)

مسلم لیگ کے حامی علماء کے پیش نظر بھی در اصل دار الاسلام کا قیام ہی تھا۔مولانا اشرف علی تھانویؒ کے متعلق مولانا عبدالماجد دریا آبادی لکھتے ہیں:

" نفس مقصد یعنی حکومت کافرانہ سے گلو خلاصی اور دار الاسلام کے قیام میں توحضرت ہم لوگوں سے کچھ پیچھے نہ تھے ، عجب نہیں کہ کچھ آگے ہی ہوں ۔حضرت کی گفتگو میں یہ جز بالکل صاف تھا،حضرت کوحکومت وقت سے جومخالفت تھی وہ اس کے کافرانہ ہونے کی بنا پرتھی ، نہ کہ اس کے بدیسی یا غیرملکی ہونے کی بنا پر"۔

(نقوش و تأثرات ۔ص۔۲۳)

مولانا عبد الماجد دریا آبادی اپنی اس تحریر کی مزید وضاحت کرتے ہوئے منشی عبدالرحمٰن خان کے نام اپنے خط میں لکھتے ہیں:

" بحوالہ نقوش وتاثرات صفحہ ۲۳،عرض ہے کہ: حضرت تھانوی کوبعض معاصر علماء کی طرح جنگ آزادی، جنگ حقوق،آزادیٔ وطن وغیرہ سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی ،ان کے سامنے مسئلہ سیاسی نہیں تمام تر دینی تھا،اوروہ صرف اسلام کی حکومت چاہتے تھے۔

1928ء میں جب پہلی بار حاضری ہوئی تو اس ملاقات میں حضرت نے دار الاسلام کی اسکیم خاصی تفصیل سے بیان فرمائی تھی ۔کہ جی یوں چاہتا ہے کہ ایک خطّہ پر خالص اسلامی حکومت ہو،سارےقوانین ،تعزیرات وغیرہ کا اجراءشریعت کے مطابق ہو، بیت المال ہو، نظام زکوٰۃ رائج ہو،شرعی عدالتیں قائم ہوں ،وقس علیٰ ھذا۔۔۔

دوسری قوموں کے ساتھ مل کر کام کرنے سے یہ نتائج کہاں حاصل ہو سکتے ہیں ، اس مقصد کے لئے تو صرف مسلمانوں کی جماعت ہی ہونا چاہئے ، اور اس کو یہ کوشش کرنا چاہئے۔

(انداز سخن ۔ص۲۱۰)

مولانا شبیر احمد عثمانی بھی مسلم لیگ کے حامی علماء میں پیش پیش تھے، اور وہ بھی پاکستان کو دراصل دار الاسلام کے قیام کا ذریعہ سمجھتے تھے، اور وہ اپنی تقریروں میں نبی ﷺ کی مثال دے کر ثابت کرتے تھے کہ جس طرح نبی ﷺ نے مدینہ منورہ میں دار الاسلام قائم کیا تھا اسی طرح ہمیں بھی پاکستان کی شکل میں ایک دارالاسلام قائم کرنا چاہئے۔

(خطبات عثمانی ،ص۱۲)

ایک دوسرے نامور عالم دین مولانا ظفر احمد تھانوی نے بھی پاکستان کی حمایت میں بڑا کام کیا۔ سلہٹ میں انہوں نے جو تاریخی تقریر کی اس میں مولانا نے پاکستان کا دار الاسلام اور ہندوستان کا دار الحرب ہونا دلائل سے ثابت کیا، اور بتلایا کہ جس حصّہ کا دار الاسلام بنانا ممکن ہو اس کو دارالاسلام بنانا مسلمانوں پر واجب ہے۔

انہوں نے بھی رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی مثال پیش کرتے ہوئے فرمایا:

کہ رسول اللہ ﷺ نے بھی مکّہ مکرمہ سے ہجرت فرما کر پہلے مدینہ کو دار الاسلام بنایا تھا۔ مکّہ کو دار الحرب رہنے دیا، کیونکہ اس وقت مکّہ کو دار الاسلام بنانے کی نسبت مدینہ کو دار الاسلام بنانا آسان تھا اس لئے ہم بھی پہلے اس حصے کو دار الاسلام بنانا چاہتے ہیں جسکی فضا ساز گار رہے اور آسانی سے وہ حصّہ دار الاسلام بن سکتا ہے۔

(تذکرۃ الظفر ص۳۸٦)

دار الاسلام

اور

مولانا مودودی

دارالاسلام اور مولانا مودودی

ھندوستانی مسلمانوں کے سامنے دارالاسلام کا واضح نصب العین پیش کرنے والوں میں مولانا مودودی کا نام سرفہرست ہے ۔ وہ جب حیدر آباد دکن سے رسالہ ترجمان القرآن نکال رہے تھے،اس وقت انہوں نے مئی 1937ء کے ترجمان القرآن میں ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے ایک راہ عمل متعین کی ، اور ان کے نصب العین کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا:

"ہم صرف اس آزادی کے لئے لڑنا چاہتے ہیں بلکہ صحیح تر یہ ہے کہ اپنے مذہب کی رو سے لڑنا فرض جانتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہو کہ یہ ملک کلیۃً نہیں تو ایک بڑی حد تک دار الاسلام بن جائے"۔

(ماہنامہ ترجمان القرآن،ربیع الاول 1356ھ،مئی 1937ء ،ص۹)

" منزل مقصود کا انتہائی مقام یعنی ہندوستان کو کلیۃً دارالاسلام بنانا تو اتنا بلند مقام ہے کہ آج کل کا کم ہمت مسلمان اس کا قصد کرنے کی جرأت اپنے اندر نہیں پاتا ،اس سے فرو تر درجہ میں جس مقصد کے لئے ہم کو لڑنا چاہئے وہ کم سے کم یہ ہے کہ ہندوستان نہ تو بیرونی کفار کے تسلط میں رہے ، اور نہ اندرونی کفار کے کامل تسلط میں چلا جائے ، بلکہ آزاد ہو کر شبہ دارالاسلام بن جائے"۔

(ایضاً ،ص۱۰)

شبہ دار الاسلام سے کیا مراد ہے؟ اس کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا مودودی نے اسی مذکورہ ترجمان کے پرچے میں لکھا:" ہم جس چیز کو شبہ دارالاسلام سمجھتے ہیں اور جو چیز درحقیقت اس نام سے موسوم ہوسکتی ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستان کی حکومت میں ہم محض

ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے حصہ دار ہوں، اور ہمارا یہ حصہ اس حد تک طاقتور ہو کہ:

1- ہم اپنی قوم کی تنظیم اصول اسلامی کے مطابق کر سکیں یعنی ہم کو حکومت کے ذریعہ سے اتنی قوت حاصل ہو کہ ہم مسلمانوں کے لئے اسلامی تعلیم و تربیت کا انتظام کر سکیں۔ ان کے اندر غیر اسلامی طریقوں کے رواج کو روک سکیں، ان پر اسلامی احکام جاری کر سکیں، اور اپنی قوم میں جو اصلاحات ہم خود اپنے طریق پر نافذ کرنے کی ضرورت سمجھیں ان کو خود اپنی طاقت سے نافذ کر سکیں، مثلاً زکوٰۃ کی تحصیل، اوقاف کی تنظیم، قضائے شرعی کا قیام، قوانین معاشرت کی اصلاح وغیرہ۔

2- ہم اس ملک کے نظم ونسق اور اس کی تمدنی اور معاشی تعمیر جدید میں اپنا اثر اس طرح استعمال کر سکیں کہ وہ ہمارے اصول تمدن وتہذیب کے خلاف نہ ہو، یہ ظاہر ہے کہ وسیع پیمانے پر تمام ملک کی اجتماعی زندگی اور معاشی تنظیم اور تدبیر مملکت کی مشین جو شکل بھی اختیار کرے گی اس کا اثر دوسری قوموں کی طرح ہماری قوم پر بھی پڑے گا۔

اگر یہ تعمیر جدید اس نقشہ پر ہو جو اپنے اصول وفروع میں کلیۃً ہماری تہذیب کی ضد ہے تو ہماری زندگی اس سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ ایسی صورت میں ہمارے لئے ناگزیر ہو جائے گا کہ یا تو ہم تمدن ومعیشت کے اعتبار سے غیر مسلم بن جائیں، یا پھر ہماری حیثیت اس ملک میں تمدنی ومعاشی اچھوتوں کی سی ہو کر رہ جائے۔ اس نتیجہ کو صرف اس طرح روکا جا سکتا ہے کہ ہند جدید کی تشکیل پر ہم اپنا اثر کافی قوت کے ساتھ ڈال سکیں۔

3- ہندوستان کی سیاسی پالیسی میں ہمارا اتنا اثر ہو کہ اس ملک کی طاقت کسی حال میں بیرونی ہند کی مسلمان قوموں کے خلاف استعمال نہ کی جا سکے۔

(ماہنامہ ترجمان القرآن مئی ۱۹۳۷ء، ص۱۱)

اسی دوران چوہدری نیاز علی صاحب نے علامہ اقبال کے مشورے کے مطابق جمال پورنزد پٹھان کوٹ، ضلع گورداسپور میں ایک ادارے کے قیام کی غرض سے کئی ایکڑ زمین وقف کی، اور علامہ اقبال ہی کے مشورے کے مطابق مولانا مودودی کو یہاں منتقل ہونے کی دعوت دی۔ چنانچہ مولانا مودودی 1937ء کے آخر میں لاہور آ کر علامہ اقبال سے بھی ملے، اور پٹھان کوٹ جا کر ادارے کے مجوّزہ مرکز کو بھی دیکھا، اور مولانا نے یہ فیصلہ کر لیا کہ آئندہ وہ حیدر آباد دکن کو چھوڑ کر یہاں پنجاب ہی میں قیام کریں گے۔

چنانچہ لاہور اور پٹھان کوٹ کا سفر کر کے واپس حیدر آباد گئے، تاکہ مستقل طور پر پٹھان کوٹ منتقل ہو جائیں۔اور مارچ 1938ء میں پٹھان کوٹ منتقل ہو گئے، لیکن افسوس کہ 21، اپریل 1938ء کو علامہ اقبال وفات پا گئے۔

دسمبر 1937ء کے ترجمان القرآن میں مولانا مودودی نے دار الاسلام کے نام سے ایک مضمون لکھا جس میں دار الاسلام کی اسکیم اس کا مقصد اور اس کی ضرورت کی مفصّل وضاحت کی۔ اور ادارہ دار الاسلام کے قیام کا اعلان کیا۔اس مضمون میں مولانا مودودی لکھتے ہیں:

ہماری تجویز یہ ہے کہ ہندوستان کے طول وعرض میں جو لوگ سچے دل سے اسلام کی خدمت کرنا چاہتے ہیں، جن کے دلوں میں حوصلے ہیں مگر پراگندگی وانتشار کی وجہ سے مایوس ہو کر بیٹھے ہوئے ہیں ان کو جہاں تک ممکن ہو رفتہ رفتہ ایک مرکز پر جمع کریں اور دار الاسلام میں ان کی اجتماعی طاقت سے خالص اسلامی ماحول پیدا کر دیں۔

(ماہنامہ ترجمان القرآن، دسمبر 1937ء، ص۵۸)

جولائی 1938ء کے ترجمان القرآن میں مولانا مودودی اپنے نصب العین کا اعادہ کرتے ہوئے پھر لکھتے ہیں:

بعض حضرات اس ادارے کے نام پر معترض ہیں، وہ اس نام کا فقہی تصور ذہن میں رکھ کر اعتراض کرتے ہیں کہ جو مقام ایک غیر مسلم حکومت کے زیر تصرف ہے، اور جہاں اقامت حدود اور تنفیذ احکام کا کوئی اختیار ہم کو حاصل نہیں ہے، اسے دار الاسلام کیسے کہا جا سکتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ مقامی دار الاسلام نہیں ہے بلکہ مقصدی دار الاسلام ہے، یعنی اس ادارے یا اس تحریک کا نصب العین ہندوستان کو از سر نو دار الاسلام بنانا اور نوجوانان اسلام کو علم، سیرت اور اسپرٹ کے اعتبار سے اس نصب العین کے لئے تیار کرنا ہے، اسی لئے اس کا نام ایسا تجویز کیا گیا ہے جو بالکل واضح طور پر اس کے مقصد کو ظاہر کرتا ہے۔ اس نام کے معنیٰ یہ نہیں ہیں کہ دار الاسلام بالفعل بن چکا ہے، بلکہ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ ہم دارالاسلام بنانے کا عزم رکھتے ہیں۔

(ماہنامہ ترجمان القرآن جولائی 1938 ص ۳)

14، اکتوبر 1938ء کو ادارہ دار الاسلام کی تاسیس باقاعدہ عمل میں لائی گئی، اس عمل تاسیس کی روئیداد اور ادارۂ دار الاسلام کا دستور العمل ستمبر 1938ء کے ترجمان القرآن میں شائع ہوا۔ اس دستور العمل میں مولانا مودودی لکھتے ہیں:

مسلمان کے لئے اپنے ماحول کو دار الاسلام میں تبدیل کرنے کی کوشش کرنا محض اقتضائے ایمان ہی نہیں ہے، بلکہ ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ مسلمان ہونے اور مسلمان رہنے کے لئے اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔

(ایضاً ستمبر ص ۳)

آگے چل کر مزید لکھتے ہیں:

اب وقت آگیا ہے کہ ہم کو مسلمان رہنے یا نہ رہنے کا آخری فیصلہ کرنا ہے۔ اگر ہم

مسلمان رہنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے ماحول کو اور پھر تمام دنیا کو دارالاسلام بنانے کا عزم لے کر اٹھنا چاہئے اور اس کے لئے جان وتن کی پوری بازی لگا دینی چاہئے، اور اگر ہم اتنی ہمت اور جرأت نہیں رکھتے تو پھر اسلام سے ہمیشہ کے لئے ہاتھ دھونے پر تیار ہوجانا چاہئے۔

(ماہنامہ ترجمان القرآن ،ستمبر 1938،ص۷)

پھر مسلمانان ہند سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں:

ان سب باتوں کو خوب جان کر اور سمجھ کر اپنے قلب کا جائزہ لیجئے کہ آیا اس میں مسلمان رہنے کا جذبہ اس دیوانگی کی حد تک پہنچا ہوا ہے یا نہیں؟ کہ وہ چیز بظاہر بالکل ناممکن الحصول نظر آتی ہے، اور جس کے حصول کی کوشش میں جان ومال کا کھلا ہوا زیان ہے، اس کی خاطر سر اور دھڑ کی بازی لگا دینے کے لئے تیار ہوجائے؟

جن لوگوں میں دیوانگی موجود ہے، اور جو اپنے مقصد کی راہ میں لڑتے ہوئے ناکام مر جانے کو دنیا کی سامرانیوں پر ترجیح دینے کے لئے تیار ہیں، صرف ان ہی کی ہم کو ضرورت ہے، اور وہی دارالاسلام کی تحریک کو چلا سکتے ہیں۔

(ایضاً،ص۸)

جنوری 1939ء میں ادارۂ دارالاسلام کا مرکز اور ترجمان القرآن کا دفتر لاہور منتقل ہوگیا لیکن اس منتقلی سے دارالاسلام کے نصب العین پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ جولائی 1939ء کے ترجمان القرآن میں مولانا مودودی لکھتے ہیں:

ہم کو جو چیز دار الاسلام کی صدا بلند کرنے پر مجبور کرتی ہے وہ بعینہٖ وہی ہے جو دوسرے لوگوں کو جمہوریت اور اشتراکیت کے نعرے بلند کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔ ہم نے برسوں اسلام کا تنقیدی اور تحقیقی مطالعہ کیا، ہم نے اس کی اعتقادی اساس، اس کے نظریہ حیات، اس کے اصول اخلاق، اس کے نظام تمدن، اس کے قوانین معاشرت اور معیشت،

اس کے آئین سیاست وطرزِ حکومت، غرض اس کی ایک ایک چیز کو جانچا اور پرکھا، ہم نے دنیا کے دوسرے اجتماعی نظریات اور تمدنی مسلکوں کو بھی کھنگال کر دیکھا، اور اسلام سے ان کا تقابل کیا۔ اس تمام مطالعے وتحقیق وتنقید نے ہمیں اس امر پر پوری طرح مطمئن کر دیا کہ انسان کے لئے حقیقی فلاح وسعادت اگر کسی مسلک میں ہے تو وہ صرف اسلام ہے۔

(ماہنامہ ترجمان القرآن، جولائی 1939 سنۂ، ص۷)

مولانا مودودی کی تحریروں سے ان اقتباسات پیش کرنے سے یہ واضح کرنا ہے کہ مولانا مودودی کا اصلی مشن دار الاسلام کا قیام تھا۔ اسی مقصد کے لئے ادارہ دار الاسلام کی تشکیل کی گئی۔ اور اسی مقصد کے لئے بعد میں جماعت اسلامی کی تشکیل کی گئی۔ قیام پاکستان میں جہاں قائداعظم کی فراست، مسلمانان ہند کی قربانی اور جان فروشی کارفرما تھی، وہاں مولانا مودودی کے افکار اور نظریات نے بھی فکری غذا فراہم کی۔

پاکستان کے قیام سے مسلمانوں کی ایک قومی جمہوری ریاست وجود میں آ گئی۔ اب اسے اسلامی ریاست بنانے کا مرحلہ باقی تھا۔ مولانا مودودی نے اس موقعہ پر نہ صرف علمی حیثیت سے یہ واضح کیا کہ ایک حقیقی اسلامی ریاست کے خدو خال کیا ہیں، بلکہ عملی حیثیت سے اس کو وجود میں لانے کی تدابیر بھی پیش کیں۔

مارچ 1949ء میں پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے قرار داد مقاصد پاس کی جس کی وجہ سے پاکستان اصولاً دار الاسلام بن گیا۔ اس دستوری تغیر کے ساتھ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی نے اپنی آئندہ پالیسی یہ طے کی کہ آئندہ ملکی انتخابات میں حصّہ لے کر آئینی طریقوں سے اس کو مکمل دار الاسلام بنانے کی کوشش کی جائے گی۔ چنانچہ مولانا مودودی "جماعت اسلامی کا مقصد تاریخ اور لائحہ عمل" میں لکھتے ہیں۔

اس قرارداد سے پاکستان کی آئینی حیثیت میں جو تغیر ہوا ہے وہ درحقیقت اس سے

زیادہ کچھ نہیں ہے کہ یہ ملک اصولاً دارالاسلام بن گیا ہے۔ اس ذرا سے تغیر نے وہ سب کچھ ہمیں نہیں دے دیا ہے، جو ہمیں مطلوب تھا۔ ابھی ایک بہت بڑا کام باقی ہے، اور وہ یہ ہے کہ اس مملکت کو عملاً دارالاسلام بنایا جائے۔

(جماعت اسلامی کا مقصد، تاریخ اور لائحہ عمل، ص۱۰۸)

اس ملک کو حقیقی دار الاسلام بنانے کی جدو جہد جاری ہے، اس میں کامیابی تب ہوگی جب اس مقصد کے لئے کام کرنے والے ہر قربانی دینے، ہر مشقت اٹھانے، ہر نقصان بھگتنے، اور ہر خطرہ برداشت کرنے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ جب تک وہ ان آزمائیشوں سے نہ گزریں گے اس وقت تک ایک دار الاسلام کے انتظام کی ذمہ داریوں کا بوجھ ان پر نہیں ڈالا جائے گا، کیونکہ وہ اس بوجھ کو سہار نہ سکیں گے، اور لوگوں کو مایوس کر دیں گے۔

☆☆☆

کتابیات

نمبر شمار	مصنّف	کتاب	ناشر	سن اشاعت
1		قرآن کریم		
2	ابن الجوزی عبدالرحمٰن	زادالمیسر فی علم التفسیر	مکتبہ اسلامی بیروت	1965
3	ابن حجر العسقلانی	فتح الباری	مکتبہ مصطفےٰ البابی، مصر	1959
4	ابن عابدین، محمد امین	ردالمختار	--	1966
5	ابوالاعلیٰ مودودی	اسلامی ریاست	اسلامی پبلیکیشنز لاہور	1967
6	---	اسلامی ریاست میں ذمیوں کے حقوق	---	1970
7	---	الجہاد فی الاسلام	---	1967
8	---	تفہیم القرآن	ادارہ ترجمان القرآن لاہور	1971
9	---	جماعتِ اسلامی کا مقصد، تاریخ اور لائحہ عمل	شعبہ نشرواشاعت جماعت اسلامی	1979
10	---	خلافت وملوکیت	اسلامک پبلیکیشنز لاہور	1966
11	---	رسائل ومسائل	---	1975
12	---	سود	---	1975
13	---	مرتد کی سزا اسلامی قانون میں	مکتبہ جماعت اسلامی	1954
14	ابوراشد فاروقی	اقبال اور مودودی	مکتبہ تعمیر انسانیت لاہور	1977
15	احسان بی، اے	رسول اللہ میدان جہاد میں		

16	اشرف علی تھانوی	بیان القرآن	شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور	1374ھ
17	البزازی محمد بن محمد	فتاویٰ بزازیہ	دار المعرفۃ بیروت	1973
18	الکاسانی ابوبکر بن مسعود	بدائع الصنائع	ایچ،ایم سعید کمپنی کراچی	1400ھ
19	الماوردی علی بن محمد	الاحکام السلطانیہ	مکتبہ مصطفیٰ مصر	1966
20	النووی یحییٰ بن شرف	المنہاج شرح صحیح مسلم	نور محمد کارخانہ دہلی	1349ھ
21	امجد علی مفتی	بہار شریعت	شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور	
22	بدر عالم میرٹھی	ترجمان السنۃ	ندوۃ المصنفین دہلی	1953
23	تنزیل الرحمٰن ڈاکٹر	مجموعہ قوانین اسلام	ادارہ تحقیقات الاسلامیہ	1978
24	حفظ الرحمٰن سیوہاروی	اسلام کا اقتصادی نظام	ندوۃ المصنفین دہلی	1946
25	خلیل احمد حامدی	جہاد اسلامی	اسلامک پبلیکیشنز لاہور	1966
26	دانش گاہ پنجاب	اردو دائرہ معارف اسلامیہ	رجسٹرار دانش گاہ لاہور	1976
27	سید قطب شہید	معالم فی الطریق		1968
28	علامہ شبیر احمد عثمانی	تفسیر عثمانی	تاج کمپنی لمیٹڈ کراچی	
29	---	خطبات عثمانی		
30	صدر الدین اصلاحی	اسلام اور اجتماعیات	اسلامک پبلیکیشنز لاہور	1978
31	عبد الرحمٰن منشی	انداز سخن	تخلیق مرکز شاہ عالم لاہور	1973
32	عبد الشکور ترمذی	تذکرۂ ظفر	مطبوعات علمی کمالیہ	1977
33	عبد الصمد رحمانی	کتاب العشر والزکوٰۃ	مکتبہ عمارت شرعیہ پھلداری شریف	1361ھ
34	شاہ عبد العزیز محدث دہلوی	فتاویٰ عزیزی	ایچ ایم سعید کمپنی کراچی	1967
35	عبد القادر عودہ شہید	التشریع الجنائی الاسلامی		1968
36	---	اسلام کا فوجداری قانون	اسلامک پبلیکیشنز لاہور	1979

37	دکتور عبدالکریم زیدان	الفرد والدولۃ فی شریعۃ الاسلامیہ	الاتحاد العالمی الاسلامی امریکہ	1970
38	عبدالماجد دریا آبادی	تفسیر ماجدی	تاج کمپنی لمیٹڈ کراچی	1952
39	---	نقوش وتاثات		
40	محمد صدیق حسن خان	الدین الخالص	مطبعۃ المدنی مصر	1959
41	مفتی محمد شفیع	معارف القرآن	ادارۃ المعارف کراچی	1971
42	محمد ادریس کاندھلوی	معارف القرآن	مکتبہ عثمانیہ لاہور	
43	محمد اسحاق سندہلوی	اسلام کا سیاسی نظام	مطبعہ معارف اعظم گڑھ	1957
44	محمد ظفیر الدین ملتانی	اسلام کا نظام امن	ایچ، ایم سعید کمپنی کراچی	
45	محمد متین ہاشمی	اسلامی حدود	انجمن اصلاح المسلمین پنڈی	1978
46	محمد نجات اللہ صدیقی	اسلام کا نظام محاصل	مکتبہ چراغ راہ کراچی	1966
47	---	اسلام کا نظریہ ملکیت	اسلامک پبلیکیشنز لاہور	1967
48	مجید خدوری	اسلام اور قانون جنگ وصلح	مکتبہ معین الادب لاہور	1967
49	امام مسلم بن الحجاج	الصحیح المسلم	نور محمد کارخانہ تجارت دہلی	1349ھ
50	ملّا علی قاری	مرقات المفاتیح	مکتبہ امدایہ ملتان	1968
51	نظام الدین برہانپوری	فتاویٰ عالمگیریہ	دارالمعرفۃ بیروت	1973
52	ماہنامہ ترجمان القرآن		لاہور	
53	ہفت روزہ آئین		لاہور	